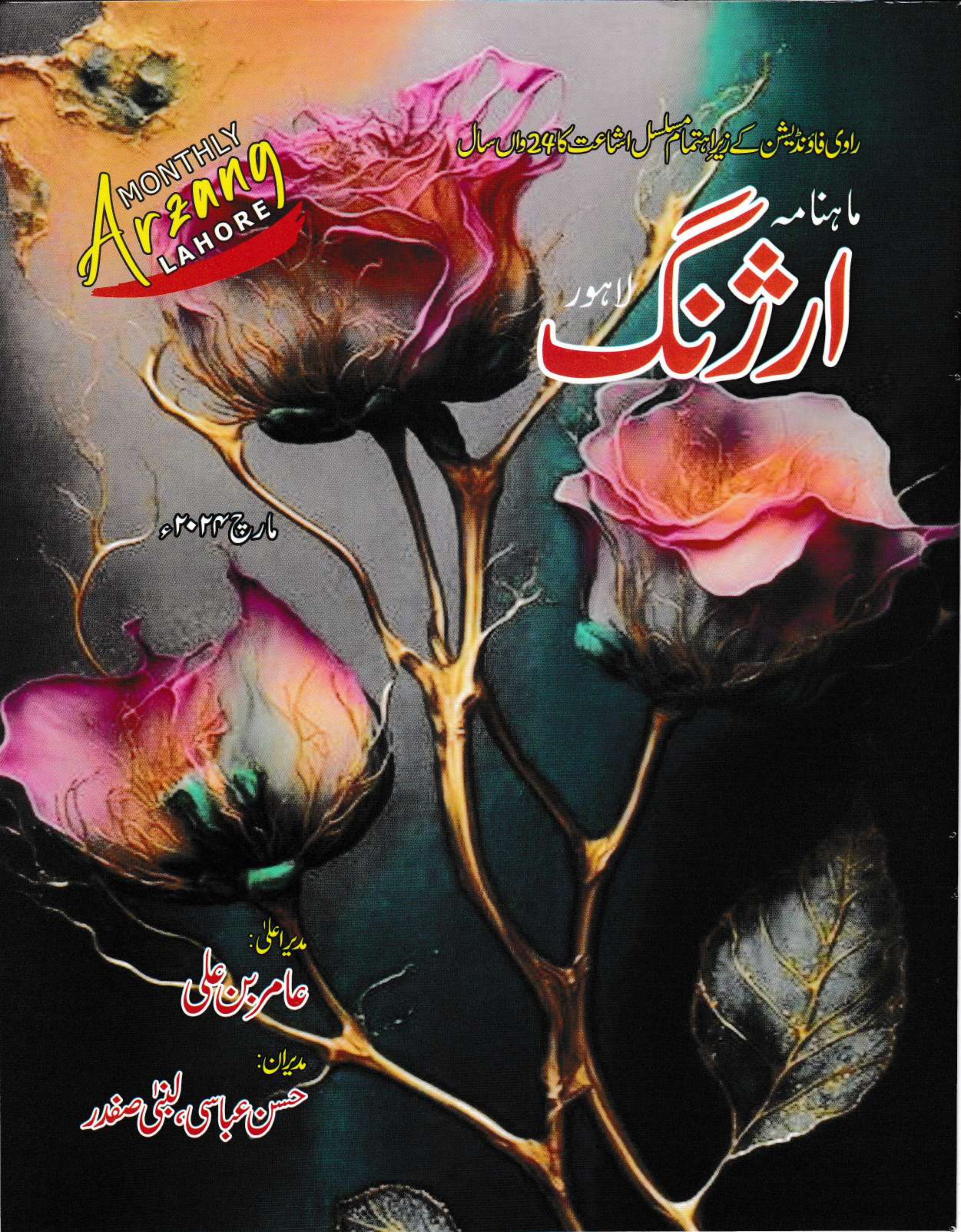

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 24واں سال

MONTHLY
Arzang
LAHORE

ماہنامہ

ارژنگ
لاہور

مارچ ۲۰۲۴ء

مدیرِ اعلیٰ:

عامر بن علی

مدیران:

حسن عباسی، لبنیٰ صفدر

کتابیں فقط میری تخلیق ہی نہیں بلکہ میری زندگی کا اثاثہ ہیں

ادب برائے زندگی کے نظریے کی قائل ہوں

پچاس کتب کی خالق معروف ناول نگار و کالم نویس،
مقبول افسانہ نویس و سفرنامہ نگار

بلقیس ریاض

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،
کالم نگار اور سفرنامہ نگار عامر بن علی کی خصوصی گفتگو

مجھے سفرنامہ نگاری زیادہ محبوب ہے چونکہ اس میں تمام اصنافِ ادب سما سکتی ہیں

لکھاری وہ ہوتا ہے جو لکھتا رہے۔ گزشتہ نصف صدی سے تخلیق کے عمل میں مصروف بلقیس ریاض ایسی ہی لکھاری ہیں جو مسلسل تخلیقی عمل میں سرگرداں رہی ہیں۔ بیس کے قریب ناول اور سات افسانوی مجموعوں کے علاوہ دو درجن سفرنامے تحریر کر چکی ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ان کے کالم شائع ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ گزشتہ دنوں لاہور کے ایک پنج ستارہ ہوٹل میں ان کی پچاسویں کتاب کی اشاعت پر ایک بھرپور تقریب رونمائی کا پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے ان سے ارژنگ کے قارئین کے لئے انٹرویو کیا جو حاضرِ خدمت ہے۔

ارژنگ:۔ سب سے پہلے تو مبارکباد قبول کیجئے کہ آپ کی کتب اشاعت کی نصف سنچری مکمل کر گئی ہیں۔

بلقیس ریاض:۔ بہت بہت شکریہ۔

ارژنگ:۔ میں شروع سے بات کا آغاز کرنا چاہوں گا، پیدائش کہاں ہوئی؟ بچپن کہاں گزرا؟

بلقیس ریاض:۔ میری پیدائش لاہور میں ہوئی اور بچپن بھی اسی شہر میں گزرا۔ بچپن ہی سے مجھے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا۔ پڑھتے پڑھتے ہی میں نے لکھنا شروع کر دیا۔

ارژنگ: گویا آپ نے تو بچپن سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا؟

بلقیس ریاض:۔ جی ایسا ہی معاملہ تھا۔ میں کانوونٹ آف جیسس اینڈ میری میں پڑھتی تھی۔ اس زمانے میں پانچویں جماعت تک اردو ہمارے اسکول میں نہیں پڑھائی جاتی تھی۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

راوی فاؤنڈیشن کے زیرِاہتمام مسلسل اشاعت کا 25واں سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

MONTHLY Arzang LAHORE

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

مارچ 2024 شمارہ 3

مدیرِ اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلسِ ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
- سعدیہ سیٹھی

مجلسِ مشاورت
- ظفر خان (آسٹریلیا)
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ	زرناب کمپوزنگ 0321-4730769
فوٹو گرافر	نعمان حسن 0333-4918383
سرورق	لبنیٰ صفدر

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت، سلام ' 2

مضامین:

- علامہ اقبال کا نظریہ خودی / طارق محمود مرزا ' 4
- والیانِ ریاست رامپور کی غالب نوازیاں / پرتو روہیلہ ' 6
- ایک تھی فوکسی / جمیل یوسف ' 14
- ادب اور زندگی / پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن ' 17
- پاکستانی معاشرے کا خلفشار اور ادیب کا کردار/ مسعود مفتی ' 19
- ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی...... چند یادیں چند باتیں/ ڈاکٹر افتخار شفیع ' 23

شعری گوشے: ڈاکٹر احمد ندیم رفیع، اقبال نوید 27 تا 25

طنز و مزاح: ○ لو، ہم ایک سال اور پرانے ہو گئے/ امجد محمود چشتی ' 28

مضامین: ○ لاہور کے عشق میں مبتلا چند مشاہیر / نیلما ناہید درانی ' 29

- دنیا کے قدیم ترین تہذیبی و ثقافتی شاعر / خاور اعجاز ' 30
- پروفیسر محمد فرید کی ہندکو ادبی خدمات / عبدالوحید بسمل ' 34
- آنکھیں، یقیں چراغ از احمد ریاض / ڈاکٹر عادل سعید قریشی ' 39
- اُردو غزل اٹھارویں اور انیسویں صدی میں / لبنیٰ صفدر ' 41
- شاعری ' 45 تا 43

افسانے: ○ بھائی / رونسن سیموئیل گل ' 46

- انعام یافتہ / انجینئر ظفر محی الدین ' 48

○ سفرنامہ: خزاں کے رنگ / عامر بن علی ' 49

انٹرویو: بلقیس ریاض ' 50

انٹرویو: ڈاکٹر محمد افتخار شفیع ' 52

- مختصر ادبی خبریں ' 56

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد، نعت، سلام

حمد

اللہ نور خود ہے خالق بھی نور کا ہے
لاریب وہ ہی مالک یومِ نشور کا ہے
شمس و قمر ستارے امرِ خدا کے مظہر
ہر ایک شے میں جلوہ خالق کے نور کا ہے
حاضر وہی ہے ہر جا لیکن نظر سے پنہاں
انداز کیا نرالا اس کے ظہور کا ہے
ارض و سما میں ہر سو حُسن و بہا اسی سے
ہر اک جہان مظہر اس کے ہی نور کا ہے
مسجود وہ حقیقی، معبود وہ ہی تنہا
حاکم وہی حقیقی سارے امور کا ہے
سنتا ہے وہ ہی اخترؔ مخلوق کی دُعائیں
سب پہ کرم جہاں میں ربِ غفور کا ہے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

نعت

فکر و غمِ جہان سے مولا رہائی دے
دائم درِ حبیبؐ کی مجھ کو گدائی دے
اک آرزو مچلتی ہے سینے میں بار بار
ہر روز مجھ کو گنبدِ خضریٰ دکھائی دے
وہ اسمِ پاک دھڑکنوں میں بس گیا ہے اب
سنتا ہوں جب بھی اسمِ محمدؐ سنائی دے
نظروں کو بھا گیا ہے اُسی شہر کا جمال
دیکھوں جدھر بھی شہرِ مدینہ دکھائی دے
تسکینِ جاں ملے مجھے ذکرِ حبیبؐ سے
ہر لحظہ مجھ کو نامِ محمدؐ سنائی دے
ہر پل ہوں انؐ کی دید کی خاطر میں بے قرار
اے کاش مجھ کو صورتِ آقاؐ دکھائی دے
لاریب سائے دور ہوں رنج و الم کے سب
آقاؐ کا نام لے کے جو بندہ دُہائی دے
کھل جائے چشمِ دل مری صدقے حضورؐ کے
پنہاں ہے جو نظر سے وہ دنیا دکھائی دے
عشقِ نبیؐ نے کر دیا دنیا سے بے نیاز
ہر گام مجھ کو منزلِ عقبیٰ دکھائی دے
حُسنِ ازل نے جس کو بنایا بہ اہتمام
پیکر وہ نور کا کبھی مجھ کو دکھائی دے
اخترؔ میں جی رہا ہوں اسی آرزو میں اب
اک بار انؐ کی صورتِ زیبا دکھائی دے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

صدقے ترے سے آقاؐ

خیرات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
دن رات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
اب بھی زہے مقدر آنکھوں کو آنسوؤں کی
برسات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
پھر حاضری کی خاطر بادِ صبا کے ہاتھوں
دعوات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
جس کی نہ ہے توقع جس کے نہیں میں لائق
وہ بات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
خوش بخت ہیں وہ جن کو بے نور گور میں بھی
مشکات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
دن کو تری محبت، شب کو ترے کرم کی
سوغات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
فرشِ زمیں پہ جن کا بستر لگا ہے، اُن کو
بانات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
مجھ سے گداگروں کو لطف و عطا کی ہر پل
بہتات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
میرے کلامِ سادہ کو خوش نوا کے فن سے
ابیات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
ہم کو ہماری اپنی اوقات سے بھی بڑھ کر
اوقات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ
زائرؔ کے گلستاں کو گل ہائے رنگ رنگ سے
بارات مل رہی ہے صدقے ترے سے آقاؐ

عبدالقیوم زائر/امریکا

نعتِ رسول ﷺ

'دلِ بے مدّعا ہے اور مَیں ہوں' (عدمؔ)

عجب منظر کھلا ہے اور مَیں ہوں
درِ خیر الوریٰ ہے اور مَیں ہوں
مرا حاجت رَوا ہے اور میں ہوں
عطائے بے بہا ہے اور میں ہوں
زباں پر مدحتیں ہی مدحتیں ہیں
اُنہی ﷺ کی یہ عطا ہے اور میں ہوں
مدینے حاضری جب سے ہوئی ہے
''دِلِ بے مدّعا ہے اور مَیں ہوں''
مَیں خود کو بھر رہا ہوں روشنی سے
درِ انوار وَا ہے اور مَیں ہوں
سجی ہے نور کی محفل، سو دل میں
چراغاں ہو رہا ہے اور میں ہوں
انہی ﷺ کی سمت تھا محوِ سفر مَیں
اب اُن کا نقشِ پا ہے اور مَیں ہوں
لبوں پر اَور کیا الفاظ آئیں؟
فقط صلِّ علیٰ ہے اور مَیں ہوں
نظر کے سامنے ہے سبز گنبد
صدائے مرحبا ہے اور مَیں ہوں

دعائیں ہوں سبھی منظور میری
یہی حرفِ دعا ہے اور میں ہوں
ابھی تو چشمِ نم سے گفتگو ہے
ابھی تو ابتدا ہے اور میں ہوں
یہیں سے ابتدا میری ہوئی ہے
یہیں اب انتہا ہے اور میں ہوں
خجالت اپنے سب اعمال پہ ہے
اب ان کا سامنا ہے اور میں ہوں
نسیم اب حاضری میں ہو حضوری
لبوں پر التجا ہے اور میں ہوں

نسیم سحر/راولپنڈی

نعت رہبرِ کامل ﷺ

سب کے ہیں غم خوار محمدؐ
سب کے ہیں دلدار محمدؐ
دُنیا بھر کے آپؐ معلم
صلی اللہ علیہ وسلم
حرفِ آخر بات ہے اُن کی
علم کا محور ذات ہے اُن کی
سب نبیوں میں آپؐ معظم
صلی اللہ علیہ وسلم
ختم نبوت اُن پہ ہوئی ہے
رب کی عنایت اُن پہ ہوئی ہے
رہبرِ کامل ہادیٔ عالم
صلی اللہ علیہ وسلم
اُنؐ جیسا کوئی اور نہیں ہے
دیکھا اُنہوں نے عرشِ بریں ہے
رب نے بنایا سرورِ عالم
صلی اللہ علیہ وسلم
سوچ سے بالا آپؐ کی عظمت
شفیق لکھوں کس طرح مدحت
لاؤں کہاں سے حرفِ مکرم

عبدالوحید بسمل

خیالوں میں مرے ہر دم مدینہ یاد آتا ہے
مری ہوتی ہیں آنکھیں نم مدینہ یاد آتا ہے
بلالو اب شہِ والا مجھے بھی تو مدینے میں
مرے رہتے ہیں دن یہ کم مدینہ یاد آتا ہے
بہاروں سا سماں لے کر مدینہ پاک سے آ کر
کوئی حاجی جو دے زم زم مدینہ یاد آتا ہے
حبیبِ کبریا کی چوکھٹِ انوار کی باتیں
سنائے جب کوئی ہمدم مادینہ یاد آتا ہے
درودوں کے لیے گجرے درِ سرکار پر حکمت
جو جائیں قافلے باہم مدینہ یاد آتا ہے

عتیق الرحمٰن حکمت

ویسے دِکھنے میں بظاہر تو یہیں ہوتی ہے
کتنی آنکھیں ہیں جو طیبہ کی مکیں ہوتی ہیں
ساری دنیا میں فقط شہرِ مدینہ ہے جہاں
غم زدہ لوگوں کی شامیں بھی حسیں ہوتی ہیں
وہ بھی ہو جاتی ہیں پوری درِ آقا پہ حسن
جو دُعائیں کبھی مانگی بھی نہیں ہوتی ہیں

حسن عباسی

بیادِ حضرت امامِ حسین رضی اللہ عنہ

اُسوہ نبیؐ کا بن گیا اُسوہ حسینؓ کا
حق بات کہنا برملا شیوہ حسینؓ کا
چلتے رہے سدا وہ عزیمت کی راہ پر
رخصت کی راہ کب ہے طریقہ حسینؓ کا
اقلیمِ صبر و شکر و رضائے خدا کا بھی
تا حشر ہے عظیم نمونہ حسینؓ کا
ظالم کے سامنے کبھی سر کو نہ خم کرو
یہ ہے پیامِ ارفع و اعلیٰ حسینؓ کا
قائم رہے جو حق و صداقت کی راہ پر
لاریب اس نے پا لیا رستہ حسینؓ کا
سبطِ نبیؐ کے خون سے رنگیں کرو نہ ہاتھ
اعدا کو تھا یہ مشورہ اعلیٰ حسینؓ کا
کاوش یہی تھی آپؓ کی، جنگ و جدل نہ ہو
ظاہر کرے ہر ایک ہی خطبہ حسینؓ کا
خائف نہیں تھا لشکرِ ابنِ زیاد سے
جاں دے کے سرخرو ہوُا دستہ حسینؓ کا
یوں تو ہر اِک شہید کا درجہ عظیم ہے
اعلیٰ ترین ان میں ہے رُتبہ حسینؓ کا
ظالم مٹے تو نام بھی ان سب کے مٹ گئے
تاریخ میں تو نام ہے زندہ حسینؓ کا
ظالم کی چار دن کی حکومت ہوئی تمام
موجود ہے دلوں میں تو غلبہ حسینؓ کا
شیرِ خدا کی جرأتوں کے آپؓ تھے امیں
عزم و جلالِ حیدری ورثہ حسینؓ کا
آتا ہے یاد روئے درخشاں امام کا
محبوب تھا حضورؐ کو چہرہ حسینؓ کا
اُمت کی ہم عبادتیں رکھیں جو اِک طرف
بھاری ہے اُن پہ آخری سجدہ حسینؓ کا
رَب نے بچایا اس طرح سے اسماعیلؑ کو
تھا انؑ کی زیست کے لیے فدیہ حسینؓ کا
اخترؔ غمِ حسینؓ میں گزرے جو زندگی
دارین میں ملے ہمیں سایہ حسینؓ کا

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

علامہ اقبال کا نظریہ خودی

طارق محمود مرزا/آسٹریلیا

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے فکر و فلسفے کا مرکزی نکتہ اور جوہر کلام اُن کا نظریہ خودی ہے۔ان کی فکر اور فلسفے کے دیگر مباحث اس نظریے کے گرد گھومتے ہیں۔ان کا فلسفہ حیات بھی یہی ہے۔علامہ اقبالؒ کے فلسفہ خودی کی تشریح اور توضیح آسان نہیں ہے۔جس فکر اور فلسفے کو بیان کرنے اور اس کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے خود علامہؒ نے کئی کتابیں لکھ ڈالیں،اسے چند سطور میں سمیٹنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔تاہم اس الہامی فلسفے کی وادیٔ اسرار میں ایک دفعہ داخل ہو جائیں تو اس کے قلبی اثرات اور کیف و سرور سے نکلنا بھی محال ہے۔

اگرچہ خودی کے لغوی معنی انانیت،خود پرستی،خود سری اور تکبر کے ہیں مگر اقبال کا فلسفہ خودی ان تمام معانی سے مختلف ہے۔جس طرح اقبالؒ کے ہاں عشق کے وہ معنی نہیں ہیں جو عام مستعمل ہیں۔اقبالؒ کی خودی میں فخر و غرور کے بجائے اپنے آپ کی پہچان، اس پہچان کو قائم رکھنے اور اپنے بل پر اپنی حیات کو استحکام دینے کا نام ہے۔اقبالؒ نے اسے نہایت وسیع مفہوم کے ساتھ اعلیٰ ترین مقصدِ حیات بنا دیا ہے۔

اقبالؒ انسان کو مظاہر فطرت سے برسرِ پیکار رہنے اور خود کو اشرف المخلوقات منوانے کا سبق دیتے ہیں۔خودی سے نہ صرف انسان بلکہ اس کے اردگرد کے افراد اور معاشرہ بھی ترقی کرتے ہیں۔اور جہاں خودی مر جائے یہ تمام ڈھانچہ نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

انسان اپنی سطح سے نیچے قعرِ مذلت میں آ گرتا ہے۔اس کی انا اور خودداری ختم ہوتی ہے تو اس کے اندر کا انسان بھی مر جاتا ہے۔اس کا شوق، اس کا جذبہ، اس کا ایمان، اس کی ہمت اور اس کی جدوجہد رُو بہ زوال ہو جاتی ہے۔

خودی بنیادی طور پر انسان کی عظمت، سربلندی اور خودانحصاری کا فلسفہ ہے۔مقصدِ حیات اور حقیقتِ کائنات کو سمجھنے کا نام ہے۔اپنے آپ کو جاننے، اپنے احساسِ ضعف پر قابو پانے اور اپنے اندر یقین و اعتماد پیدا کرنا خودی ہے۔یہ انسان کو حقیقی معنوں میں اشرف المخلوقات ثابت کرنے کی راہ ہے۔انسان کی ظاہری، باطنی، دُنیاوی، آخروی، انفرادی اور اجتماعی کامیابی کی کلید ہے۔

مگر اس کی کھوج آسان نہیں ہے۔خودی کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے اندر کی پوشیدہ صلاحیتوں کو پہچانے، اُنھیں گرمیِ شوق سے مزید آنچ دے اور اسے بروئے کار لائے۔خودی کا مطالبہ ہے کہ دوسروں کے دستِ نگر نہ بنو۔اپنے اوپر بھروسہ کرو اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی دنیا آپ پیدا کرو۔انسان اگر اپنی باطنی قوتوں کا ادراک کر سکے تو حیران ہو کہ قدرت نے اس کے اندر کتنی صلاحیتیں اور جوہر عطا کر رکھے ہیں۔جنھیں اکثر اوقات انسان کھوجتا نہیں ہے۔یوں یہ پیش بہا صلاحیتیں استعمال ہوئے بغیر دم توڑ دیتی ہیں۔خودی ان صلاحیتوں، ان کمالاتِ انسانی کو سامنے لانے میں مدد دیتی ہے۔

فلسفہ خودی کے خالق حضرت علامہ اقبالؒ نے انسان کو اپنے اندر ڈُوبنے اور خودی کی تلاش کی راہ دکھلائی ہے:

اپنے من میں ڈُوب کر پا جا سراغِ زندگی
تُو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

آسان الفاظ میں احساسِ غیرت مندی، خودداری، اپنی ذات اور ان کا پاس رکھنا اور حرکت و عمل سے اپنے وسائل خود پیدا کرنا خودی ہے۔

خودی سے حیات جوبن دکھاتی ہے اور کائنات کا وجود تکمیل پاتا ہے۔خودی کا اصل منبع بہرحال انسان ہی ہے۔کائنات اور اس کے مظاہر انسان کی سمجھ بوجھ اور شعور سے جڑے ہیں، اس کی صلاحیتوں کی آزمائش، اس کی جستجو کا سامان ہیں۔بہ الفاظ دیگر انسان کو اپنی زندگی کا مقصد، کائنات سے اس کا تعلق اور خالق سے اس کا رشتہ کیا ہے، یہ سب کچھ جاننے کے لیے جس علم اور جستجو کی ضرورت ہے وہ عرفانِ ذات ہے۔خودشناسی ہے۔دُنیا میں آنے کا مقصد اور اس مقصد کی راہ پر چلنا خودی ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک خودی پا کر انسان اپنی منزل اور اس کے راستے پر چل سکتا ہے۔اپنا نصب العین جان سکتا ہے اور یہ مقصد اسے غیر فانی بنا دیتا ہے۔حیاتِ جاوداں عطا کر دیتا ہے۔حتیٰ کہ ظاہری موت بھی اسے ختم نہیں کر سکتی۔اقبال نے بتایا کہ خودی کا جوہر یکتا ہے۔وہ کسی دوسری غرض میں مدغم نہیں ہو سکتا نہ کسی اور شکل میں نمایاں ہو سکتا ہے۔ہاں خودی کی مناسب پرداخت نہ ہو تو وہ فنا ہو سکتی ہے۔

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

اقبالؒ کے مطابق خودی اور مادی شے کے زمان و مکان یکساں نہیں ہوتے۔وہ مادی اشیا کو مجبورِ محض خیال کرتے ہیں جب کہ ان کے مطابق انسانی اختیار، ارادہ اور قوتِ عمل کی کوئی حد نہیں ہے۔اس لیے انسانی ذات کا پابند زمان و مکان سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔فرماتے ہیں:

God Himself cannot feel, judge, and choose for me when more than one course of action are open to me.

اقبالؒ کے نزدیک خودی انسان کا اثاثہ ہے۔زندگی کا تحفظ ہے۔استحکام ہے۔ازل سے ابد تک خودی کا عمل دخل رہے گا۔اس کی کامرانیاں، اس کی فرماں روائی، اس کی رفعتیں اور اس کی وُسعتیں بے حد و بے حساب ہوں گی۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

اقبال نے خودی کو لا الہ الا اللہ سے منسلک کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خودی کی بنیاد توحید پر استوار ہے۔ ایمان اسے مضبوط بناتا ہے۔ ایک اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہ سمجھنا خودی کا راز ہے۔ خودی کا ہتھیار ہے۔ خودی کی مضبوطی، اس کی بقا اور اس کی کامیابی کا ضامن ہے۔

خودی کا سرِّ نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغِ فساں لا الہ الا اللہ

خودی کی مسلسل تربیت اور نگہداشت انسان کو مضبوط بنا کر راہِ عمل پر لے جاتی ہے اور بے خودی اسے عمل سے غافل کر کے کاہلی، دوسروں پر انحصار کرنا اور دستِ سوال دراز کرنے کی جانب سے لے جاتی ہے۔ خودی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن جذبہ ہے۔ یہ زندہ اور توانا ہو تو انسان استغنا کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کے فقر میں شہنشاہی کی سی شان پیدا ہو جاتی ہے اور کائنات اس کے تسخیرِ عمل تلے آ جاتی ہے۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر

اقبال کا فلسفہ خودی (بمع جزیات) انسان کو صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ کے منصب کا اہل بناتا ہے۔ اس قانون اور اصول کے ساتھ فرد اپنے ساتھ ملک اور معاشرے کو بھی خالصتاً حکمِ الٰہی کے تحت چلانے کی سعی کرتا ہے کیونکہ اس کی خودی اُسے ناانصافی اور غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔ فرد اور ملت کے درمیان جو رابطے اور اصول وضوابط ہونے چاہیں، خودی ان راستوں پر عمل کر کے معاشرے کو بھی اَرفع مقام تک لے جاتی ہے۔ خودی انسان کو تنہائی اور گوشہ نشینی کی نہیں بلکہ معاشرے میں سر اٹھا کر جینے اور اجتماعی ذمہ داریاں اٹھانے کی ترغیب دیتی ہے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبالؒ کی خودی وہ بلند ترین مرتبہ ہے جو اپنی ذات کی کثافتوں کو لطافتوں میں ڈھالنے کے اس مقام پر عطا ہوتا ہے جب بندے اور رب کی منشا ایک ہو جاتی ہے جب انسان اپنی تقدیر خود لکھنے کے قابل بن جاتا ہے۔ یہی اقبال کے فلسفہ خودی کی معراج ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اقبالؒ کے نزدیک ہر انسان کے اندر خفیہ اور خام صلاحیت پوشیدہ ہے۔ اس خام صلاحیت کو سمجھنے، اسے توانا بنانے اور اسے بروئے کار لانے سے انسان تکمیلِ ذات کی جانب بڑھتا ہے۔ یہ کشمکشِ حیات بھی ہے۔ مقصدِ حیات بھی ہے اور انسان کا اس دنیا میں امتحان بھی ہے۔ اس کشمکش میں وہی انسان بلندی کے زینے طے کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو پہچانے، اپنی نظر سب سے بلند رکھے اور اسی کے مطابق جدوجہد جاری رکھے۔ اقبالؒ نے فرمایا:

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آب جو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

انسان کا جو عمل عظمتِ انسانی اور تکمیلِ انسانی کا موجب ہو وہ خودی کا محافظ ہے۔ وہ نیک عمل ہے۔ مثبت راستہ ہے۔ اسی پیمانے سے دیگر کاروبارِ حیات کو ناپا جا سکتا ہے۔ خودی انسان کو مصروفِ عمل اور بے چین رکھتی ہے۔ انسان کے اندر ایک ہلچل اور بے قراری قائم رکھتی ہے۔ یہی بے قراری جوش و جذبے میں بدلتی ہے۔ تخلیق کے جوہر میں ڈھلتی ہے اور ترقی کے زینے طے کرتی ہے۔ وہ ترقی جو انسان اور معاشرہ دونوں کے لیے مفید اور کارآمد ہے۔ انسان کا باطن اس کے ظاہری بدن سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور حیران کن ہے۔ بدن کی ترقی ایک سطح پر آ کر رک جاتی ہے جبکہ انسان کی باطنی شخصیت کی نشوونما اور ترقی کے امکانات کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے بڑھنے کے لیے لامحدود خلا موجود ہے۔ علامہ اقبال اس باطنی وجود کی نشوونما کے لامحدود ممکنات کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

ہر شاخ سے یہ نکتہ پیچیدہ ہے پیدا
پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا
ظلمت کدہ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا

اگر زمین کی ظلمتوں میں پڑے ایک بیج میں اپنی نشوونما کا اتنا جنون ہے کہ وہ زمین کا سینہ چیرتے ہوئے باہر نکلتا ہے اور فضا میں بلند ہو جاتا ہے تو انسانی ذات کے ارتقا کے امکانات اس سے کہیں زیادہ اور حیران کن ہیں کیونکہ اس میں رُوحانی اور وجدانی طاقت موجود ہے۔

جس طرح بیج زمین سے نکل کر پودا بنتا اور بلند ہوتا چلا جاتا ہے اسی طرح انسانی ذات بدن کے اندر رہتے ہوئے بالیدگی حاصل کرتی ہے۔ بدن کی نشوونما اور ترقی محدود ہے لیکن انسانی ذات کی بلندی پرواز کی کوئی حد نہیں ہے۔

اقبالؒ ہر اس نظریے، سوچ اور عمل کو خودی کے منافی سمجھتے ہیں جو انسان کو بے عملی، سست روی اور بغیر جدوجہد کے توکل کرنا سکھاتا ہو۔ وہ قناعت اور صبر کو ان معنوں میں غلط سمجھتے ہیں کہ انسان ہاتھ پیر ہلائے بغیر پڑا رہے اور اپنی جائز خواہشات اور مقام کو صبر و شکر کے نام پر قربان کر دے:

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بُو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

جب حضرت انسان نے جنم لیا تو ربِّ کریم نے خودی کو آرزو کی صورت انسان کے قلب میں رکھ دیا۔ آرزو نے جستجو کو جنم دیا۔ جستجو سوچ و فکر کے بیل بوٹوں سے ہوتی ہوئی خودی تک پہنچ گئی۔ خودی کے آتے ہی ایک شعلہ سا اپنے قلب میں محسوس کیا۔ اس شعلے کی حدّت نے اسے پہلے عرفانِ ذات اور پھر تسخیرِ کائنات کے سفر پر روانہ کر دیا جو تا ابد جاری رہے گا تاوقتیکہ اپنے رب کی طرف لوٹ نہیں جاتا۔

والیانِ ریاست رامپور کی غالب نوازیاں

پرتو روہیلہ

غالب شناسی تو در کنار کہ ساری زندگی کی روحانی وقلبی وابستگی سے عبارت ہے، غالب سے تھوڑی سی دلچسپی رکھنے والا بھی اس قدر ضرور جانتا ہے کہ غالب کا ریاست رامپور سے بڑا قریبی تعلق رہا اور والیانِ ریاست رامپور بھی ان کے والہ وشیدا رہے اور نہ صرف یہ کہ اپنے تعلق خاطر کی سیرابی ونشوونما میں انہوں نے دامے، درمے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا بلکہ جہاں ''سخنے'' کی ضرورت تھی، بڑی مستعدی اور تدبّر سے کام لے کر غالب کو فرنگیوں کے عتاب سے بچایا اور سرخروئی کے مراتب پر پہنچا دیا۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کہ ریاست رامپور کے ایک بڑے فرماں روا یعنی نواب یوسف علی خان ان کے شاگرد تھے اور یہ رشتہ ہی ایسا تھا کہ ولایت ریاست وفرماں روائی سے بہت بلند ہوتا ہے۔ لیکن ٹھہریے، بات ایسے مرحلے پر ہے کہ کچھ وضاحت چاہتی ہے ورنہ والیان ریاست کا غالب سے رشتۂ تلمذ تشنہ رہ جائے گا۔

مالک رام نے تلامذۂ غالب میں ایک سو چھیالیس (۱۴۶) شاگردوں کا حال لکھا ہے۔ یہاں ایک انتہائی دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ ان ایک سو چھیالیس شاگردوں میں کہ سارے ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے، (۳۳) تینتیس ایسے تھے جن کا تعلق روہیل کھنڈ سے تھا۔ جن میں حکیم احسن خان رامپوری، جم نواب جمشید علی خان مرادآبادی، جنون خان بہادر قاضی عبدالجمیل بریلوی، معشوق علی خان شاہ جہاں پوری، مائل میر عالم علی خان سہسوانی، صوفی محمد علی نجیب آبادی، عزیز عزیز الدین بدایونی، حکیم غلام نجف خان شیخوپوری شامل ہیں۔ روہیل کھنڈ کیا ہے، کسے کہتے ہیں بلکہ کیا تھا، کسے کہتے تھے، زیادہ مناسب الفاظ ہیں۔ اس کو سمجھے، بغیر نہ قارئین اس تعلق کی داد دے سکتے ہیں جو ان والیانِ ریاست کو غالب سے تھا اور نہ وہ اس شیفتگی کا اندازہ کر سکتے ہیں جو اہالیان روہیل کھنڈ کو غالب سے تھی۔ سو چند سطریں روہیل کھنڈ اور ریاست رامپور کے وجود میں آنے کے باب میں۔

حیات حافظ رحمت خان مصنفہ الطاف علی بریلوی مطبوعہ نظامی پریس بدایون (یو۔ پی۔ انڈیا) ۱۹۳۳ میں مصنف نے روہیل کھنڈ کے بارے میں لکھا ہے ''ہماری کتاب کو ہندوستان کے اس پر فضا، شاداب اور زرخیز قطعہ زمین سے تعلق ہے جو کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ہے اور جس کے بڑے حصے کو نہ صرف ہندوستان کے سب سے بڑے دریا نے جو ہندوؤں کی نظر میں پوتر سمجھا جاتا ہے اور جس کو آسمانی ورنا کے نام سے پکارا جاتا ہے (یعنی گنگا) سیراب کرتا ہے بلکہ رام گنگا اور دوسرے چھوٹے چھوٹے دریاؤں نے بھی...... اس کی آب وہوا پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا ہے۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جنہوں نے آج سے دوسو سال پہلے افغانی قسمت آزماؤں کو اپنی طرف کھینچا اور اس خوش نما مرکز اور پرفضا قطعہ ملک کو اپنا گھر بنا لیا اور وہ اپنے وطن ''روہ'' کی نسبت سے کٹھیر سے روہیل کھنڈ بن گیا۔ روہ افغانستان میں کوہستانی سلسلہ ہے۔ حافظ رحمت خان کے مورث غوروغزنی سے منتقل ہو کر اسی کوہستانی سلسلے میں آباد ہو گئے تھے اور اسی نسبت سے روہیلہ کہلائے۔''

ہر چند کہ میں اپنے قارئین کو محیط عنوان سے قدرے باہر لیے جا رہا ہوں لیکن سمجھتا ہوں کہ گفتگو اب اس مرحلے پر آ پہنچی ہے کہ قارئین یہ جان سکیں کہ لفظ 'روہ' سے کیا مراد ہے اور 'روہ' دراصل کس علاقے کو کہتے ہیں۔ ان تمام تواریخ میں جو ہندوستان میں ان افغان قبائل کے بارے میں لکھی گئیں جو صدیوں سے جوق در جوق افغانستان اور اس کے ملحقہ پہاڑی علاقوں سے ہندوستان کے میدانی علاقوں میں قسمت آزمائی کے لیے آتے رہے ہیں'' 'روہ' کو غوروغزنی کے کوہستانی سلسلے'' کے طور پر یاد کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیات حافظ رحمت خان کے فاضل وعالم مصنف الطاف علی بریلوی بھی بانی روہیل کھنڈ حافظ رحمت خان اور ان کے اجداد کے بارے میں ''روہ افغانستان میں کوہستانی سلسلہ ہے۔ حافظ رحمت خان کے مورث غوروغزنی سے منتقل ہو کر اس کوہستانی سلسلے میں آباد ہو گئے تھے اور اسی نسبت سے روہیلہ کہلائے'' سے زیادہ کچھ نہ لکھ پائے۔

اپنی قلبی خلش کے ہاتھوں میں نے کئی متخصصین تاریخ سے بھی رجوع کیا یہاں تک کہ اکابرین پشتو اکیڈمی پشاور کے در دولت پر بھی حاضری دی لیکن گوہر مراد ہاتھ نہ آیا۔ چنانچہ ڈاکٹر حبیب اللہ تگے (تگے تخلص مولف۔ پشتو لفظ بمعنی تشنہ) کی انگریزی کتاب کے اردو ترجمے ''پشتون''، مترجم شوکت ترین کی کتاب کے باب ۸۔ صفحہ ۱۶۴ کے ایک مختصر اقتباس پر اکتفا کرتا ہوں۔

''لیکن یہ کہ روہ کون سا علاقہ ہے۔ اس بارے میں بھی ان کتابوں میں جو بابر کے زمانے میں لکھی گئی ہیں بہت سی وضاحتیں ہیں لیکن سب سے قدیم کتاب جس میں میں نے روہ کی تعریف پڑھی ہے عبداللہ کی تاریخ داؤدی ہے جس میں ایک جگہ مذکور ہے کہ روہ کی لمبائی سواد۔ بجور (صوات۔ باجوڑ) سے لیکر بھکر کے نزدیک قصبہ سیوئی تک اور چوڑائی حسن ابدال سے لے کر کابل اور قندہار تک ہے اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے اسے 'روہ' کہا جاتا ہے۔''

''نظام الدین کی طبقات اکبری، محمد قاسم کی

تاریخ فرشتہ اور نعمت اللہ ہروی کی مخزن افغانی میں بھی ان ہی کی طرح تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن نواب محبت خان بڑیچ (فرزند حافظ رحمت خان) جس نے ریاض المحبت ۱۸۰۶ میں مکمل کی تھی اور اس ضمن میں اصولاً اہل صلاحیت ہے 'روہ' کو ایک عظیم مملکت قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''مشرق کی طرف کشمیر تک، مغرب کی طرف ہیرمند (ہلمند) جو کہ ڈھائی مہینے کا سفر ہے واقع ہے۔ شمال کی طرف کاشغر تک جنوب کی طرف بلوچستان تک واقع ہے۔ (یہ) افغانوں کا ملک ہے اور افغان اس میں آباد ہیں۔''

تاریخ داؤدی کی مندرجہ بالا تعریفوں سے بھی مایوس ہو کر میں نے مشہور انگریز مورخ اولف کیرو کی مشہور زمانہ کتاب The Pathans بھی ٹٹولی۔ انہوں نے اس کتاب میں پانچ جگہ پر 'روہ' کا ذکر کیا ہے۔ ان کا آخری حوالہ (پٹھان، اردو ترجمہ شائع کردہ پشتو اکیڈمی پشاور۔ اشاعت اوّل ۱۹۶۷) ص ۵۸۳۔ پر ہے۔ اگرچہ یہ 'روہ' کے حوالوں میں طویل ترین ہے لیکن مبحث کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر کر دینے والا۔ چنانچہ ان تعریفوں اور تفصیلوں سے صرف نظر کرتے ہوئے میرا اپنا تاثر یہ ہے (اور میرے اس تاثر میں بزرگ اہلیان روہیل کھنڈ کے تاثرات بھی شامل ہیں) کہ 'روہ' افغانستان، پاکستان اور بلوچستان کے سارے پشتو بولنے والے علاقوں کے لیے ایک عام و سہل النشان لفظ وضع کر لیا گیا ہے۔ فی نفسہٖ اس علاقے کی حدود نہ کبھی ماضی میں متعین تھیں اور نہ آج ہیں۔ ہندوستان میں صدیوں رہنے کے باوجود 'روہ' سے ہجرت کرنے والا ہر شخص اپنے قبیلے کی شناخت رکھتا تھا۔ چنانچہ رامپور جیسے چھوٹے سے شہر میں بڑیچ، یوسف زئی، کمال زئی، خٹک، محمد زئی وغیرہم اپنے خاندانوں سے پہچانے جاتے تھے۔ تاریخی نقطہ نظر سے بادی النظر میں یہ سب روہیلے تھے۔ چونکہ ان کے باپ دادا پشتو بولتے ہوئے ہندوستان آئے تھے اور ان کے پڑھے لکھے افراد دوسری زبان کے طور پر فارسی جانتے بھی تھے اور بول بھی سکتے تھے۔

''روہیل کھنڈ شمالی ہند (یو۔پی) کا نہایت زرخیز اور اہم علاقہ ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے زمانے ہی سے لاہور اور دہلی کے بعد یہ علاقہ اسلامی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہوا۔ بدایوں میں نو مسلم حکومت کے قیام سے پہلے ہی مسلمانوں کے نقش قدم پہنچ چکے تھے۔ سنبھل (ضلع مراد آباد، یوپی) اور بدایوں وغیرہ مسلمانوں کے قدیم مفتوحہ مقامات میں قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش دہلی کی حکومت پر فائز ہونے سے پہلے بدایوں کے گورنر رہے۔ چنانچہ آج بھی قطبی و شمسی آثار وہاں موجود ہیں۔ علاؤالدین بادشاہ دہلی نے دہلی چھوڑ کر بدایوں میں سکونت اختیار کی۔ سکندر لودھی کئی سال تک سنبھل (ضلع مراد آباد) میں مقیم رہا۔

مغل متاخرین کے زمانے میں اس علاقے میں روہیلہ پٹھانوں کا غلبہ اور استیلا قائم ہو گیا۔ دہلی کی مرکزی حکومت کی کمزوری کے سبب انہوں نے اس علاقے میں نیم خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ اس طرح روہیلوں کے غلبے کی وجہ سے یہ علاقہ روہیل کھنڈ مشہور ہو گیا۔ اُس زمانے میں تو اس علاقے کی وسعت بہت تھی اور روہیلوں کی حکومت ''از سنگ تا کنگ'' مشہور تھی مگر اب اس کے باقیات ایک کمشنری کی صورت میں باقی ہیں اور کمشنری روہیل کھنڈ میں سات اضلاع بریلی، بدایوں، شاہجہاں پور، پیلی بھیت، مراد آباد، رامپور اور بجنور شامل ہیں۔'' (محمد ایوب قادری غالب اور روہیل کھنڈ ماہنامہ قومی زبان کراچی فروری ۱۹۷۲)

نواب علی محمد خان نے ۱۷۴۲ء میں راجا ہرنندن کھتری کو شکست دے کر علاقہ کٹھیر پر قبضہ کر لیا اور رامپور بریلی مراد آباد سنبھل پیلی بھیت، بدایوں اور بجنور پر قبضہ کر کے ایک وسیع ریاست قائم کی اور آنولہ ضلع بریلی کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ اسی زمانے میں یہ علاقہ روہیل کھنڈ کے نام سے مشہور ہوا۔ نواب علی محمد خان کی وفات کے بعد روہیلہ سرداروں میں نااتفاقی کے سبب یہ وسیع حکومت ان کے چھ بیٹوں میں تقسیم ہو گئی اور رامپور ان کے بیٹے فیض اللہ خان کے حصے میں آیا چنانچہ نواب فیض اللہ خان ریاست رامپور کے پہلے حکمران قرار پائے۔'' (تاریخ رامپور ۱۹۳۰ تا ۱۹۴۹ از شوکت علی خان، رام پور رضا لائبریری رامپور)

چنانچہ اس سلسلے میں غالب کے زمانے کے آنے تک نواب یوسف علی خان اس ریاست کے چھٹے والی و حکمران تھے جو ۱۸۵۵ء میں چالیس سال کی عمر میں مسند نشین ہوئے۔

''نواب یوسف علی خان مرحوم صاحبزادگی کے زمانے میں جب تحصیل علم کے لیے دہلی آئے تھے اس وقت مرزا صاحب سے بہت رابطہ تھا۔ مفتی صدرالدین خان مرحوم سے عربی پڑھتے تھے اور مرزا صاحب سے فارسی۔ اس قصیدے میں اسی زمانے کو یاد دلایا ہے۔

زاں خسرو خوباں چہ قدر چشم وفا بود
صد حیف کہ شد نقش امیدم ہمہ باطل

افسانۂ غم گر بسرایم نہ بود عیب
با دوست کہ پیوستہ ہمی برد غم از دل
اے یوسف ثانی کہ بود در ہمہ عالم
مشتاق جمال تو چہ دیوانہ چہ عاقل

ص ۳۱۲۔ یادگار غالب۔ حالی

ان حقائق کے پیش نظر اپنے دور ابتلا میں غالب کا نواب یوسف علی خان سے وابستہ ہو جانا انتہائی فطری عمل معلوم ہوتا ہے'' لیکن درحقیقت اس تعلق دیرینہ کو بحال و استوار کرنے میں بڑا کردار مولانا فضل

حق خیر آبادی کا تھا جو ان دنوں رامپور میں فروکش تھے۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً سرکار (نواب یوسف علی خان) کے روبرو میرزا صاحب کے اشعار پڑھے جس سے سرکار ان سے مراسلت اور مشورہ سخن کے مشتاق ہو گئے۔'' (مکاتیب غالب ص ۷۵)۔ ادھر مولانا نواب یوسف علی خان کو اس سرپرستی پر آمادہ کرتے اور ادھر غالب کو بھی اس کار خیر میں اپنی کامیابی سے آگاہ کرتے جاتے۔ چنانچہ صاحب مکاتیب غالب کے مطابق مولانا نے میرزا کو لکھا کہ سرکار کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جائیے۔ اور اصلاح اشعار کا کام انجام دیجئے۔ مولانا کا گرامی نامہ میرزا کو ۲۷ جنوری ۱۸۵۷ء کو موصول ہوا۔ جس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء کا تحریر کردہ وہ پہلا عریضہ نواب یوسف علی خان کو ارسال کیا جس میں اپنی بے مثال انشاء نگاری کا گلستاں کھلاتے ہوئے لکھا ''کہ ترجمہ: (آج) قلم کی سجدہ گزاری اور عریضہ نگار کی معذرت طلبی دونوں یکجا ہو گئے ہیں...... اور اس امر کا تشکر بھی حد سے زیادہ ہے کہ ذرے کو آفتاب سے شناسائی اور قطرے کی دریا سے قرابت کے طور پر (اس) فقیر کی (بھی) بادشاہ سے کوئی اجنبیت نہیں۔ توقع یہ ہے کہ راستے کی درازی درمیان میں خلل انداز نہ ہوگی اور آئندہ میں جناب کے پیش خدمتوں اور ریاست کے دعاگوؤں میں شمار کیا جاؤں گا......'' اس کے جواب میں نواب نے جو خط تحریر کیا وہ ۵ فروری ۱۸۵۷ء کا ہے جس میں انہوں نے سیدھے سادھے پٹھان کی طرح اپنے مرتبے کی رودرعایت کے بغیر لکھا ''مکرمی ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم نہ شدہ بود لیکن محض بہ جہت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب دلم خواست کہ طریقہ رسل و رسائل جاری شود۔ چوں سبیلے بہ ازیں بہ نظرم نہ رسید لہٰذا چند ابیات واہیات موزوں نمودہ بترصد اصلاح پیش آں یگانہ آفاق مرسل گشت......''

ترجمہ: ''ہر چند کہ راقم خط نے آج تک ایک مصرع بھی موزوں نہیں کیا لیکن جناب عالی کا کلام گرامی مولوی صاحب کی زبانی سن سن کر یہ خواہش ہوئی کہ مکاتبت کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اور چونکہ اس کی اور کوئی (دوسری) سبیل نظر نہیں آتی تھی یہ واہیات تک بندی دنیا کے اس یگانہ کی خدمت میں بامید اصلاح ارسال کی جارہی ہے۔''

خط کی بے تکلفی عجز و انکسار کا بے باک ہمسرانہ اظہار اور حقیقت پسندانہ رویہ قابل داد ہی نہیں قابل صد ستائش بھی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کی سیکڑوں ریاستوں کے فرماں رواؤں میں کسی والیٔ ریاست نے کبھی بھی اپنے رشتہ تلمذ کی تقدیس کے لیے اس قسم کے لحاظ اپنی ذات کے بارے میں تحریر کیے ہونگے۔ نواب صاحب نے خط کے ساتھ سو روپے کی ہنڈوی بھی روانہ کر دی اور اس طرح نواب یوسف علی خان ۵ فروری ۱۸۵۷ء کو رسماً اسد اللہ خان غالب کے حلقہ تلمذ میں بھی داخل ہو گئے۔ اور اسی طرح غالب کے ۱۵ فروری ۱۸۵۷ء کے ایک خط کے جواب میں جس میں غالب نے کئی الفاظ (بجز یوسف) تخلص کے لیے پیش کئے تھے نواب صاحب نے ''ناظم'' بہ حیثیت تخلص اختیار کر لیا۔

لیکن جلد ہی غدر کے ہنگامے کے سبب نظام ڈاک متاثر ہوا۔ ادھر نواب فردوس مکاں روہیل کھنڈ کی بغاوت فرو کرنے میں بھی طویل عرصے تک منہمک تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرزا صاحب اور سرکار کی اگست ۱۸۵۷ء سے جنوری ۱۹۵۸ء تک مراسلت نہ ہو سکی۔ لیکن اس کے باوجود کہ غالب قلعے سے تعلق کے سبب گورنمنٹ کی نظر میں مشکوک شخص تھے اور غدر کے بعد کافی عرصے تک یہی صورت حال باقی رہی، نواب یوسف علی خان متعدد بار ان کو ڈھائی ڈھائی سو روپے بھیجتے رہے۔ اور بالآخر بمطابق ایک حکم نامہ محررہ ۱۴ جولائی ۱۸۵۹ جولائی ۱۸۵۹ء سے غالب کے لیے سو روپے ماہوار مہینہ مقرر ہوا جو غالب کی خواہش کے عین مطابق تھا۔ غالب چونکہ دہلی میں تھے اس لیے یہ روپیہ انہیں باقاعدگی سے ہنڈوی کے ذریعے بھیجا جاتا لیکن وسعت قلبی کا انداز یہ تھا کہ ان سے کبھی اس روپے کی رسید نہیں طلب کی گئی۔ چنانچہ غالب خود اپنے ایک خط بنام سیاح مورخہ ۳۰ جولائی ۱۸۶۵ء میں فرماتے ہیں:

''ایک قرن، بارہ برس سے فردوس مکاں نواب یوسف علی خان والیٔ رامپور سو روپے مہینہ ماہ بر ماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ دانی دیکھئے کہ مجھ سے کبھی اس روپے کی رسید نہیں لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔''

آخر آخر جب غالب اپنی ناتوانی کے سبب اشعار کی اصلاح کے لائق بھی نہ رہے تو انہوں نے اپنے ضعف کی وجہ سے اس کام سے بھی معذرت چاہی اور نواب صاحب کو لکھا ''اصلاح نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا، متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے۔'' لیکن نواب صاحب کا انداز کریمانہ یہ تھا کہ وظیفہ جو درحقیقت پرورش لوح و قلم ہی تھا برابر جاری رہا۔

اس تعلق خاطر کی سیرابی و شادابی کے لیے جو نواب صاحب کو غالب سے تھا ان کا مسلسل اصرار تھا کہ غالب رامپور آئیں اور وہ ان کی میزبانی سے شاد کام ہوں۔ لیکن غالب اپنی ضعیف العمری اور مختلف عوارض کے سبب رامپور جانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ آمادہ ہو بھی جاتے تو ضعف ان کی طنابیں کھینچ لیتا اور ان کی خواہش پایہ تکمیل کو نہ پہنچ پاتی۔ لیکن زمینی حقائق سے پوری آگاہی کے باوجود نواب صاحب کے شوق

میزبانی میں کسی صورت کمی نہ آتی۔

صاحب مکاتیب غالبؔ نے اپنی تالیف میں یکے بعد دیگرے نواب صاحب کے چھ دعوت نامے گنوائے ہیں۔ یہ دعوت نامے جو سنہ ۱۸۵۸ء سے شروع ہو کر ۱۶ دسمبر ۱۹۵۹ تک ہیں اور ہر دوسرا کہ پہلے سے اپنی شدتِ مودّت واشتیاقِ میزبانی میں بڑھ کر ہے، نواب صاحب کے خلوص کے آئینہ دار ہیں اور ایسا خلوص جو کلیتاً بےلوث ہے۔ ادھر غالبؔ جو اپنی پنشن کی بحالی کے منتظر اور اس منتہائے مقصود کے حصول کے امیدوار ہیں، ہر دعوت نامے پر اس قسم کے عذر پیش کرتے ہیں۔

''نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتے سے میری پنشن کے کوائف طلب کیے اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے، وہاں سے کلکتے کو بھیجے جائیں گے پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور بار برادری مانگی، آج سواری اور بار برداری پہنچی اور کل میں نے رامپور کی راہ لی۔''

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے قارئین کے تفنن طبع کے لیے نواب صاحب کے آخری دعوت نامے کا متن بھی پیش کر دوں۔ یہ خط نواب صاحب کے ذوق میزبانی کی توثیق تو کرتا ہی ہے اس زمانے کی ثقہ دفتری اردو تحریر کا بھی ایک اچھا نمونہ ہے۔

''سابق...... میں چند مرتبہ درباب تشریف فرمائی یہاں کے متکلف ہوا ہوں لیکن اب تک آپ نے سرور ملاقات بہجت آیات سے مسرور نہیں فرمایا۔ اب لازم اشتیاق کا یہ ہے کہ آپ تشریف شریف باسرع ازمنہ ارزانی فرما دیں اور مخلص کو مشکور الطاف کا کریں۔''

پھر جب آغاز ۱۸۶۰ء میں غالبؔ کو پنشن کے مقدمے میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے بڑی یکسوئی سے رامپور کی روانگی کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں بےخبر کو لکھتے ہیں۔

''بعد فتح دہلی وہ (نواب یوسف علی خان) ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے، میں عذر کرتا تھا جب جنوری ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا جو اوپر لکھ آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔''

غالبؔ کا سفر رامپور جو دراصل ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو شروع ہوا کثیر المقاصد سفر تھا۔ بنیادی طور پر تو وہ نواب یوسف علی خان کی دیرینہ پر اصرار دعوت کی تعمیل میں ہی جا رہے تھے لیکن اس سفر کے ضمنی مقاصد میں والیٔ رامپور کے ذریعے جو کہ گورنمنٹ کے سرکردہ معاونین میں تصور کیے جاتے تھے اپنے معاملات کا حل اور گورنمنٹ سے اپنی صفائی بھی چاہتے تھے۔ بہرحال ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء میں دہلی سے چل کر میرزا غالبؔ میرٹھ میں غلام مصطفٰی خان کے ہاں ایک دن ٹھہرتے ہوئے آٹھ دن بعد بتاریخ ۲۷ جنوری ۱۸۶۰ء رامپور پہنچے۔ اس سفر میں ان کے ہمراہ عارف مرحوم کے دونوں لڑکے باقر علی خان، حسین علی خان، کلو خانساماں، عنایت اللہ خادم اور دو دوسرے خادم بھی تھے۔ اور یہ سب نواب صاحب کے مہمانان گرامی تھے۔

غالبؔ اور ان کی جمعیت کو نواب صاحب کے خاص باغ پیلس میں اتارا گیا جو رامپور کی ایک انتہائی خوبصورت عمارت تھی۔ تین چار دن کے بعد غالبؔ کے ایما پر انہیں شہر کے اندر محلہ راج دوارہ کی اس شاہراہ پر جو خاص باغ کو جاتی ہے ڈاک خانے سے متصل ایک مکان دیدیا گیا۔ (اس مکان پر نواب رضا علی خان والیٔ وقت کے حکم کے مطابق ۲۱ فروری ۱۹۴۴ء کو ایک یادگاری پتھر نصب کر دیا گیا جو آج بھی رامپور والوں کو غالبؔ کی یاد دلاتا رہتا ہے)۔ غالبؔ اور ان کے ہمراہیوں کے لیے کچھ دن تک تو سرکاری مطبخ سے کھانا آیا کرتا تھا لیکن چند دن کے بعد ان کی سہولت کے لیے کھانے کے سو روپے ماہوار علیحدہ مقرر کر دیئے گئے۔ چنانچہ غالبؔ نے خود مجروحؔ کو اپنے خط میں لکھا ہے کہ

''اب جو میں وہاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپے مہینا پاؤں اور دلی رہوں تو سو روپے۔''

رامپور میں غالبؔ کے ورود سے متعلق انتہائی اہم بات ان کا استقبال و پذیرائی ہے۔ اس موضوع پر عرشی صاحب لکھتے ہیں ''سرکار نے بروقت ملاقات احباب کی طرح معانقہ کیا اور احباب میں تعظیم و توقیر کی جو رسم ہے اس کو ملحوظ رکھا۔ اس بارے میں غالبؔ نے خود مجروحؔ کو اپنے ایک خط میں لکھا ہے

''تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہے۔''

اب والیٔ رامپور کے اس شریفانہ انسانی رویے کے برعکس لکھنو کے نائب السلطنت روشن الدولہ کے سلوک کو یاد کیجئے جہاں غالبؔ کی ملاقات کی دونوں انتہائی مہذب و مروج انسانی قدریں کہ مجھ سے کھڑے ہو کر ملاقات کریں اور نذر سے معافی دیں نامنظور ہوئیں اور غالبؔ بےنیل و مرام بغیر ملاقات کئے کلکتے روانہ ہو گئے۔

غرض نواب یوسف علی خان کے برادرانہ و مخلصانہ سلوک سے غالبؔ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ اپنے ایک خط میں مجروحؔ کو لکھتے ہیں ''بھائی سو، دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ وشاگردانہ دیتے ہیں۔''

غالبؔ کے رامپور کے قیام کی دوسری انتہائی اہم بات وہاں کی آب و ہوا ہے جو غالبؔ کو اس قدر پسند

آئی کہ انہوں نے اس کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے اور اس آب و ہوا کی برکات کا نقطۂ عروج یہ کہ ''سریع النفوذ، اس آٹھ دس دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں صبح کو خوب بھوک لگتی ہے ......'' (خط بنام حکیم غلام نجف خان)، ایسا لگتا ہے یہ بھی میزبانی کی نیک نیتی کا تصرف تھا۔

رامپور کی آب و ہوا کی موافقت اور نواب صاحب کی توقیر و تعظیم کے سبب میرزا رامپور میں طویل قیام کرنا چاہتے تھے لیکن عارف کے لڑکوں کی شرارتوں نے ان کو تنگ کر دیا۔ ''اگرچہ بچوں کے بہلاوے کے لیے بکریاں، کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا سب درست'' تھے لیکن ان بچوں کی شرارتوں سے تنگ آکر غالب نے نواب صاحب کی طرف سے برسات کے آموں کی پیشکش کو بھی مسترد کرتے ہوئے رخت سفر سمیٹا اور ایک ماہ بیس دن رامپور میں قیام کر کے عازم دلی ہوئے۔ رامپور سے ان کی روانگی ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو اور دلی میں ۲۴ مارچ ۱۸۶۰ کو ورود ہوا۔

دلی میں غالب کے ورود کے تقریباً ساڑھے چار سال بعد یعنی اکتوبر نومبر ۱۸۶۴ء میں جنت مکانی یوسف علی خان عارضہ سرطان میں مبتلا ہوئے اور ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو ان کا انتقال ہوگیا اور ان کے صاحبزادے نواب کلب علی خان تخت نشین ہوئے۔ اب میرزا صاحب کا تعلق چونکہ صرف جنت مکانی یوسف علی خان سے تھا جسکی ابتدا شاگردی سے ہوئی تھی میرزا کو والیِ رامپور کی طرف سے اس مستقل وظیفے کے یکدم بند ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوا تو انہوں نے فوراً خلد آشیاں نواب کلب علی خان کو تہنیت نامہ ارسال کیا۔ نواب کلب علی خان نے میرزا کی پریشانی کا درست اندازہ کرتے ہوئے یکم مئی ۱۸۶۵ء کو اس کا جواب ان الفاظ میں دیا

''مشفقا آنچہ مشاہرہ آن کرم فرما از عہد نواب صاحب قبلہ فردوس مکاں مقرر است، انشاء اللہ تعالیٰ بدستور مانده حسب ضابطہ بخدمت سامی رسیده خواہد ماند''

تہنیت نامے کا امید افزا جواب پا کر میرزا صاحب نے قصیدہ مبارک ارسال کیا۔ اور اس طرح اپنے بڑھاپے کی مجبوریوں کے باوجود کلب علی خان کی جشن تخت نشینی کے لیے رامپور جانے کا عندیہ دیا۔ وہ قصیدہ جو اس تہنیت کے لیے لکھا اس کا مطلع یہ ہے

تجلیٰ کہ زموسیٰ ربود ہوش بطور
بہ شکل کلب علی خان دگر نمود ظہور

(ص۔۳۸۶، کلیات غالب فارسی، مرتبہ سید مرتضی فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب لاہور)

خلد اشیانی نواب کلب علی خان نے جشن تخت نشینی کے لیے دسمبر ۶۵ کا پہلا ہفتہ مقرر فرمایا تھا۔ نواب صاحب کو غالب کی شرکتِ جشن پر آمادگی کی اطلاع نواب مرزا داغ کے ذریعے پہنچی تو انہوں نے قصیدے کی رسید کی اطلاع دیتے ہوئے ان سے جشن میں ملاقات کے اشتیاق و مسرت کا اظہار اپنے خط میں جو ۱۱ جون ۱۸۶۵ء کو تحریر کیا گیا تھا ان الفاظ میں کیا:

''دریں ولا زبانی نواب مرزا عزم سامی بایں طرف مسموع گشت موجب کمال مسرت ہاست چرا کہ راقم نیز متمنی ملاقات شریف است۔ او تعالیٰ شب یلدائے فراق را بزودی بہ ایام وصال مبدّل گرداند۔''

کلب علی خان کے جشن تخت نشینی کے لیے غالب ۲۔ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو دن چڑھے دلی سے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں ان کے ہمراہیوں میں باقر علی خان، حسین علی خان، کلو خانساماں، نیاز علی اور دو آدمی اور تھے۔ میرزا صاحب پالکی میں اور دونوں لڑکے کبھی رتھ اور کبھی گھوڑوں پر سفر کرتے۔ راستے میں کہیں کہیں قیام کرتے چھ منزلیں طے کر کے جمعرات کے دن ۱۲۔ اکتوبر کو رامپور پہنچے۔

نواب خلد آشیاں نے ان کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ قیام کے لیے جرنیلی کوٹھی میں ٹھہرایا اور کھانا سرکاری باورچی خانے سے مقرر ہوا۔ کھانے اور دانے کی تفصیل کے ساتھ غالب کی طمانیت قلب کا احوال ان کے خط بنام غلام نجف خان ملاحظہ فرمائیے

''خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، تنجن، پسندے دونوں وقت کی روٹیاں خمیری چپاتیاں، مربے، اچار، میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلوا چھا ہوگیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاک روب سرکار سے متعین ہے، حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی مقرر ہوگئی اس میں میرا فائدہ ہے نقصان نہیں۔''

نواب کلب علی خان قدر دانی علم و ہنر میں اپنے والد مرحوم کے سچے جانشین تھے۔ انہوں نے ان کی تعظیم و توقیر جس مرتبے پر پہنچا دی اور ان کے حسن سلوک نے غالب کو جس طرح متاثر کیا وہ خود غالب کے خطوط سے جو انہوں نے اس دوران اپنے احباب کو لکھے ہیں ملاحظہ کیجیے

خط بنام حکیم غلام نجف خان ''اب روداد سنو۔ نواب صاحب کا اخلاص روز افزوں ہے۔''

خط بنام حکیم غلام رضا خان ''نواب صاحب حال بمقتضائے الولد سرّ لابیہ، حسنِ اخلاق میں نواب فردوس آرام گاہ کے برابر بلکہ بعض شیوہ و روش میں ان سے بہتر ہیں۔ بجرد مسند نشینی کے غلے کا محصول یک قلم معاف کیا۔ علی بخش خانساماں کو تیس ہزار روپیہ بابت

مطالبہ سرکاری بخش دیا۔مفصل حالات بذل نوال عندالملاقات زبانی کہونگا۔''

خط بنام علائی ''رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں۔قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہ بھائی ضیاء الدین خان، عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور حلیہ متفاوت، حلیم، خلیق، باذل، متواضع، متشرع، متورع، شعرفہم سینکڑوں شعر یادنظم کی طرف توجہ نہیں۔نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔جلالائی طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔شگفتہ جبیں ایسے کہ ان کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔فصیح بیان ایسے کہ ان کی تقریرسن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔الھم دام اقبالہ وزاد اجلالہ۔''

بقول صاحب مکاتیب غالبؔ، غالبؔ کا مشہور لطیفہ جو ان کی حاضر جوابی ومزاح کا بڑا اعلیٰ نمونہ بھی ہے غالبؔ کے اسی دورہ رامپور کی پیداوار ہے۔

''نواب خلد آشیان تخت نشینی سے قبل اضلاع ریاست کے معائنے کوتشریف لے گئے تھے۔میرزا صاحب نے بھی رضوان کے ۴ نومبر ۶۵ کے خط میں ان کے سفر کے پروگرام کی تفصیل لکھی ہے۔جب سرکار (روانگی کے لیے) سوار ہونے لگے تو مشایعت کے لیے میرزاؔ صاحب بھی سواری تک آئے۔سرکار بارکاب ہوئے تو حاضرین کے ساتھ میرزا نے بھی آداب وکورنش ادا کی۔سرکار نے میرزا صاحب کے آداب پرتبسم کے ساتھ فرمایا ''خدا حافظ'' میرزا صاحب کی شوخی طبع نے گدگدایا اور آپ نے قدرے حزیں صورت بنا کر کہا حضرت، خدا نے مجھے آپ کے سپرد کیا ہے آپ پھر الٹا مجھ کوخدا کے سپرد کر رہے ہیں۔''

دسمبر کا پہلا ہفتہ جشن تخت نشینی کے لیے مقرر ہوا تھا اور اس تقریب کا اس درجہ شاندار اہتمام کیا گیا تھا کہ میرزا صاحب نے اس کو ''جشن جمشیدی'' سے تعبیر کیا ہے۔ غالبؔ کے ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط بنام علائی سے اس کی جھلک بھی دیکھتے چلئے۔

''یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔شہر سے دو کوس پر آغا پور نامی ایک بستی ہے آٹھ دن سے وہاں خیام برپا تھے۔پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی معہ چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اترے۔کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔سب سرکار رامپور کے مہمان۔کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پرنور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے اور خلعت پہن کر آئے۔وزیر علی خانساماں خواصی میں سے روپے پھینکتا ہوا آتا تھا۔دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم ایثار نہ ہوا ہوگا۔آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے۔شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔روشنی آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا جائے۔

میرزا صاحب نے اس تقریب کی مبارک باد پر ایک نثر اور ایک (۳۰) تیس اشعار کا قصیدہ خلد آشیاں کے حضور پیش کیا۔قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

تا چہ نیرنگ است ایں کاندر جہاں آوردہ اند
نوبہاری طرفہ در فصل خزاں آوردہ اند

میرزا صاحب کا ارادہ تھا کہ جشن کے اختتام کے کچھ دن بعد رخصت طلب کریں۔چنانچہ ۲۲ دسمبر ۶۵ء دونوں پوتوں باقر علی خان اور حسین علی خان کو جو اس وقت نوجوان تھے روانہ کر کے علائی کو جو کچھ لکھا وہ بھی اس معاشرت و ماحول زندگی کی اہم دستاویز کے طور پر تحریر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔شاید ۱۸۵۷ء ان اعمال کا ہی منطقی نتیجہ تھا۔

''آج صبح کے سات بجے باقر علی خان اور حسین علی خان چودہ مرغ بڑے اور آٹھ چھوٹے لے کر دلی روانہ ہوئے دو آدمی میرے ان کے ساتھ گئے۔کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔نواب صاحب نے وقت رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا۔''

غرض جمعرات کے دن ۲۸ دسمبر ۶۵ کو غالبؔ رامپور سے رخصت ہوئے۔نواب خلد آشیاں ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو ایک ہزار روپے عطا کر چکے تھے تاہم ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو بوجہ زادراہ (۲۰۰) دوسو روپے مزید عطا کیے۔

رامپور سے واپسی میں میرزا صاحب کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔مراد آباد کے نیچے دریائے رام گنگا بہتا ہے سرمائی بارش کے سبب اس میں سیلاب آ گیا تھا۔میرزا صاحب کی پالکی پار ہوتے ہی کشتیوں کا پل ٹوٹ گیا۔اسباب کی گاڑیاں اور ملازم اس پار رہ گئے اور یکہ و تنہا ایک کمبل لیے مراد آباد کی سرائے میں اقامت گزیں ہوئے اور اس سردی اور بے آرامی کی وجہ سے بیمار ہو گئے۔پانچ دن صدر الصدور مراد آباد کے یہاں قیام کیا اور جب قدرے ٹھیک ہوئے تو دلی کا عزم کیا۔لیکن دلی پہنچنے سے پہلے ہی مصطفیٰ خان شیفتہ کی زبانی خلد آشیانی کو ان تکالیف اور ان کی علالت کا علم ہو گیا تھا سو نواب صاحب نے ان کے مراد آباد کے پتے پر فوراً خط لکھا۔

''زبانی نواب مصطفیٰ خان بہادر کے دریافت ہوا کہ مراد آباد میں طبیعت آپ کی علیل ہوگئی ہے۔باستماع اس امر کے باعث کمال تردد ہوا۔اس واسطے حوالہ خامہ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ خیریت مزاج سے مطلع کیجئے۔اگر ہنوز طبیعت مائل اعتدال نہ ہوا اور آپ کا ارادہ قیام مراد آباد کا تادرستی طبیعت ہو تو آپ رامپور میں تشریف لائیے یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئے گا۔''

لیکن غالبؔ وہاں سے روانہ ہو چکے تھے اس لیے نواب صاحب کا وہ خط انہیں نہیں ملا۔البتہ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی پہنچنے کے بعد انہوں نے دلی

پہنچنے کی اطلاع دی جس پر نواب صاحب نے لکھا۔

''الحمد للہ کو وصول نمیقہ لطف آگیں باعث اطمینان ہوا۔''

نواب یوسف علی خان کے دور اقتدار ہی سے یہ تعلق سراسر دوستانہ و رفیقانہ ہی رہا۔ چنانچہ ان رقوم کے علاوہ جو وظیفے کے طور پر انہیں دی جاتی رہیں نواب صاحب مختلف تحائف و ہدایا بھی ارسال کرتے رہے۔ صاحب مکاتیب غالب نے لکھا ہے ''سرکاری کاغذات سے پتا چلتا ہے کہ ۸ جون سنہ ۱۸۶۰ء کو نواب فردوس مکاں نے آموں کی دو بہنگیاں تحفہ بہار یہ کہہ کر روانہ کی تھیں۔ اس کے بعد جون ۲۹ کو دو بہنگیاں ''حسب دستور'' کے الفاظ سے روانہ کیں اور پھر آغاز جولائی ۶۴ میں دو سو آم بھیجے۔'' اب اس تعلق کا دوسرا وقیع تر و انتہائی حقیقت پسندانہ پہلو جو واقعی اس رشتے کو رفیقانہ دوستانہ بنا دیتا ہے یہ ہے کہ نواب صاحب بھی غالب کو دلی میں اپنا معتمد خاص تصور کرتے اور اگر انہیں کسی ایسی چیز کی ضرورت ہوتی جو رامپور یا اطراف میں دستیاب نہ ہوتی تو انتہائی بے تکلفی سے غالب کو لکھتے اور واقعی غالب انتہائی مستعدی اور خوشی سے اس خواہش کی تعمیل کرتے۔ قارئین کرام کو ان انتہائی معمولی ضرورتوں اور خواہشوں کے بارے میں پڑھ کر یقیناً خوش گوار حیرت ہوگی، بالکل جس طرح مجھے ہوئی۔ سوان کے تفنن طبع کے لیے ایک دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ نواب صاحب اپنے ایک خط مورخہ ۱۷ اپریل ۱۸۶۰ء میرزا صاحب کو لکھتے ہیں:

''مشفقا (یہ غالب کے لیے نواب کا مخصوص طرز خطاب تھا) جو یہ ایام رنگتر ہائے دمریزی کے ہیں، اس واسطے حوالے خامہ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ بمقتضائے لطف و عنایت فرمائی مخلصانہ کے ایک ایک بہنگی رنگتر ہائے دمریزی کی بتفاوت دس دس روز کے تا اختتام فصل روانہ اس سرکار کے فرماتے رہیے اور قیمت رنگتروں اور اجرت کہاروں بہنگی سے مطلع فرمایئے تاکہ مطابق ان کے ہنڈوی آپ کی سامی خدمت میں بھیجی جائے۔''

''پھر ۱۸۶۴ء میں نواب فردوس مکاں نے چوب چینتی (جس کو چوب چینی لکھا گیا ہے۔ دراصل یہ چوب چینتی ہے جو ایک دوا کا نام ہے۔ یہ گل عباسی کی جڑ ہوتی ہے) کی فرمایش کی۔ میرزا صاحب نے بڑی کوشش سے پانچ سیر رنگین و سنگین و بے گرہ یا کم گرہ قطعات چوب چینتی مہیا کر کے سرکاری کہار کے ہاتھ روانہ کی۔ اور از راہ معذرت لکھا ''دلی اب شہر نہیں کنپ (کمپ Camp) ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر کے امرا نہ اطراف شہر کے روسا۔''

اسی طرح ایک بار نواب یوسف علی خان نے دسمبر ۶۱ میں ایک چوبے گردھاری لال کے لیے حکیم نیاز علی سے نسخہ تجویز کرا دینے میں غالب کی استعانت چاہی اور اس کے لیے غالب کو بتاریخ ۱۹ دسمبر ایک خط بھی لکھا۔ ''چوبے صاحب و حکیم صاحب ملاقات شاں بخوبی کنانندہ تجویز علاج بخوبی بعمل آید۔'' اور پھر ایک ساکن رامپور اور متوسل سرکار لالہ شب سہائے ساہو، کے آنکھوں کے معالجے کے لیے غالب کو ۱۴۔ اگست ۶۴ کو خط لکھا۔ ''در بارہ علاج لا معزی الیہ کے اطبائے حاذق سے مراتب لطف اور مہربانی کے ان کے حال پر مرعی اور مبذول فرمادیں۔''

باہم سلوک کا یہی رویہ نواب کلب علی خان کے دور میں بھی جاری رہا۔ وہ بھی غالب کو اپنا ذاتی اور ریاست کا ایک معتمد و مخلص دوست تصور کرتے۔ چنانچہ ان کی طرف سے بھی وہ رفیقانہ اور دوستانہ فرمائشیں ہوا کرتی تھیں جو آج کے غالب کے قاری کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ اور غالب بھی بے تکان اپنی فرمائش داغ دیتے تھے۔ کلب علی خان کی تخت نشینی کے لیے غالب دلی سے رامپور آ رہے تھے تو نواب ضیاء الدین خان نیر نے ان سے کہا کہ رامپور سے ایک بانس کی غلیل بھی لے کر آیئے گا۔ اس غلیل کا احوال غالب کے ایک خط بنام علائی ملاحظہ کیجیے:

''میاں چلتے وقت تمہارے چچا نے غلیل کی فرمائش کی تھی۔ رامپور پہنچ کر وہ بے سعی و تلاش ہاتھ آ گئی۔ بنوا رکھی...... اب چلنے سے پہلے تم نے (بھی) غلیل مانگی۔ جستجو کی، کہیں بہم نہ پہنچی۔ دس روپے تک مول کو نہیں ملی نواب صاحب سے مانگی۔ توشے خانے میں بھی نہیں تھی......''

اب نواب کلب علی خان کی غالب سے ایک فرمائش ملاحظہ کیجیے۔ بقول صاحب مکاتیب غالب جولائی ۶۷ء نواب خلد آشیاں نے دلی کے ایک شطرنج باز فاضل نامی کو رامپور بھیجنے کی تحریک کرائی۔ میرزا صاحب نے اسے رامپور روانہ کر کے اطلاعاً نواب صاحب کو لکھا ''بموجب تحریر مرزا رحم الدین بہادر حیات کے فاضل شطرنج باز کو خرچ دے کر روانہ کر دیا گیا۔''

والیان رامپور کے انتظام و انصرام کی بے مثل صلاحیت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اپنے پیچھے جمع و خرچ و حساب و کتاب کا ایسا مکمل ریکارڈ چھوڑ گئے کہ محترمی و مکرمی امتیاز علی خان عرشی نے مکاتیب غالب میں غالب کے ضمن میں ریاست کا ہر خرچ ایک ایک مد میں پائی پائی علیحدہ علیحدہ پیش کر دیا۔ مشکل ہی سے کوئی ادبی مورخ ایسا خوش قسمت اور جز رس ہوگا کہ معاملات کو اس ژرف نگاہی سے دیکھتا ہو۔ عنوان زیر نظر کی مزید تکمیل کے لیے اور شیدائیان ادب کی مزید تسکین کی خاطر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تفاصیل بھی آج ایک بار پھر ادب کے منظر نامے پر کھل کر آ جائیں اور اکثر ادبی امور کی طرح نا آگاہی یا کم آگاہی کے سبب جھٹپٹے میں نہ رہیں۔ سو مندرجہ بالا طویل گفتگو کا لب لباب کہ سوداگری کے محاورے میں

Bottom-line کہلاتا ہے، یہ ہے کہ ''میرزا صاحب کو بارہ برس میں دربار رامپور سے جو مالی مدد ملی اس کی مقدار مجموعی سولہ ہزار سات سو پچیس روپے ہے۔ اس رقم میں سے کچھ اوپر دس ہزار نواب فردوس مکان (نواب یوسف علی خان) نے اور باقی نواب خلد آشیاں (کلب علی خاں) نے عطا فرمائے اس امداد میں وقتی عطیے اور وظیفہ دونوں شامل ہیں۔ اس کی کل مقدار گیارہ ہزار پانچ سو پچاس روپے ہوتی ہے۔''

عطیات کی تفصیل عرشی صاحب نے علیحدہ دی ہے جو ان کی تفصیل پسندی اور جزرسی کا بین ثبوت ہے۔ اس مد کی تفصیل تقریب وار مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ بہ تقریب شیرینی شاگردی ۵ فروری ۱۸۵۷ء ۲۵۰ روپے

۲۔ بہ تقریب شرینی تبرید نوشی ۲۳ مارچ ۱۸۵۷ء ۲۵۰ روپے

۳۔ بہ غرض امداد مالی ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء ۲۵۰ روپے

۴۔ بہ غرض امداد مالی ۳۱ اگست ۱۸۵۷ء ۲۵۰ روپے

۵۔ بہ غرض امداد مالی ۲۵ نومبر ۱۸۵۷ء ۲۵۰ روپے

۶۔ بہ غرض مصارف خدام ۲۰ مئی ۱۸۵۹ء ۲۵۰ روپے

۷۔ بہ غرض امداد مالی ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء ۲۵۰ روپے

۸۔ بہ غرض امداد مالی ۱۵ مارچ ۱۸۶۰ء ۳۰۰ روپے

۹۔ شادی نواب سید حیدر علی خان بہادر ۲۴ جنوری ۱۸۶۱ء ۲۰۰ روپے

۱۰۔ بہ تقریب توڑے جوڑے ۱۱ جولائی ۱۸۶۱ء ۱۲۵ روپے

۱۱۔ بہ تقریب سفر انبالہ برائے شرکت دربار گورنر جنرل ۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء ۲۰۰ روپے

۱۲۔ بہ غرض امداد مالی ۱۳ اکتوبر ۱۸۶۳ء ۲۰۰ روپے

۱۳۔ بہ تقریب غسل صحت نواب خلد آشیاں ۱۶ اگست ۱۸۶۵ء ۲۰۰ روپے

۱۴۔ بہ تقریب جشن تخت ۷ نومبر ۱۸۶۵ء ۱۰۰۰ روپے

۱۵۔ بہ تقریب زادراہ دہلی ۹ جنوری ۱۸۶۶ء ۲۰۰ روپے

۱۶۔ بہ تقریب ادائیگی قرض ۱۶ اکتوبر ۶۶ اور ۸ جنوری ۶۷ء کے درمیان ۴۵۰ روپے

۱۷۔ بیگم غالب کو غالب کی ادائیگی قرض کے لیے ۹ نومبر ۱۸۶۹ء ۶۰۰ روپے

ان عطیات کی مجموعی رقم پانچ ہزار ایک سو پانچ روپے ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا مدات کے علاوہ عرشی صاحب نے قصائد کی پیشکش پر علیحدہ وضاحت کی ہے۔ اور میرزا صاحب کے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے جو انہوں نے نواب کلب علی خان خلد آشیاں کو ارسال کیا تھا بر سبیل پیروی روایت سابقہ تحریر کیا ہے کہ ''میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں مدحیہ قصیدہ بھیجتا تو وہ ۲۵۰ روپے کی ہنڈوی بھیجا کرتے تھے جس کی دفتر سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔'' اب عرشی صاحب کی تحقیق پسندی بھی داد و تحسین کی حقدار ہے کہ انہوں نے واقعی تحقیق کر ڈالی اور اپنے تحقیق کے نتائج پیش کرتے ہوئے ایک ایک قصیدے کے مطلع کا حوالہ معہ اس کی تاریخ پیشکش بتاتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تیسرا اور چوتھا قصیدہ جو علی الترتیب نومبر اور دسمبر ۱۸۶۴ء میں بھیجا گیا تھا محتاج عطیہ ہی رہا اور اس ضمن میں ان کے الفاظ یہ ہیں اس صورت میرزا صاحب کا دعویٰ محتاج ثبوت ہے۔

اب اس انتہائی دلچسپ لیکن طویل تحریر کا اختتام میں نواب یوسف علی خان فردوس مکانی کے خط پر کرتا ہوں جس میں انہوں نے انتہائی انکساری اور خلوص سے ارسال کردہ رقائم میں عدم رسی کی معذرت کی ہے۔

''جو کہ آپ خفا ہونا مخلص کا بہ سبب عدم رسی رقائم اخلاص محتوی رسیدات صحائف موصوفہ اپنے تحریر فرماتے ہیں۔ اے حضرت مخلص صمیم تو آپ کو بزرگ اور عنایت فرما اپنا جانتا ہے۔ توقف رسی رقائم نیاز کی باعث خفگی نہ تصور فرمائیے۔'' یہ خط والیان ریاست و حاکمانِ وقت کے لکھے گئے دفتروں کے طومار میں ایسا منفرد خط ہے کہ جو والیان ریاست رامپور کے شخصی و ذاتی کردار کو منہاج فراعین سے یکسر علیحدہ کر کے ایک ایسے راستے کی نشان دہی کرتا ہے جو انسانی اقدار سے روشن اور مزین ہے اور جو اُس دیار خیر کی طرف جاتا ہے جہاں انسان طبقاتی تقسیم سے آزاد و معرّیٰ ہے۔

ان والیان ریاست کا یہ کردار اس سبب سے اور بھی لائق ستائش ہے کہ سرکاری و درباری مقتضیات، بے حس حاکمیت اور غیر انسانی فرعونیت کے بیچ در بیچ ماحول میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے پشتینی مساوات و اخوت کے نسلی امتیاز کو برقرار رکھا۔

کتابیات: ۱۔ یادگارِ غالب ۔ الطاف حسین حالی، عکسی بازیافت ۱۹۹۷ء

۲۔ تلامذہ غالب ۔ مالک رام مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ۱۹۸۴ء

۳۔ حیات حافظ رحمت خان، الطاف علی بریلوی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں (یوپی، انڈیا ۱۹۳۳ء)

۴۔ غالب اور روہیل کھنڈ۔ محمد ایوب قادری، ماہنامہ قومی زبان کراچی فروری ۱۹۷۲ء۔

۵۔ تاریخ رامپور (۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۹ء) شوکت علی خان، رضا لائبریری رامپور۔

۶۔ مکاتیب غالب ۔ امتیاز علی خان عرشی ۔ مطبوعہ ۱۹۴۷ء

۷۔ پٹھان ۔ اولف کیرو کی کتاب The Pathan کا اردو ترجمہ۔ شائع کردہ پشتو اکیڈمی یونیورسٹی آف پشاور جولائی ۱۹۶۷ء

۸۔ پشتون۔ ڈاکٹر حبیب اللہ تگے کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ مترجم شوکت ترین، ۲۰۰۴ء۔

۹۔ کلیات غالب (فارسی) مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، طبع اوّل، ۱۹۶۷ء مجلس ترقی ادب لاہور۔

ایک تھی فوکسی

جمیل یوسف/مری

1966ء میں میری تنخواہ پانچ سو روپے تھی۔ آج جب کہ بازار میں سیب تین ساڑھے تین سو روپے کلو بک رہے ہیں اور کیلا ڈھائی سو روپے درجن ہے۔ پانچ سو روپے تنخواہ عجیب و غریب لگتی ہے۔ مگر نسل نو کے قارئین حیران نہ ہوں۔ اُس وقت کسی بھی پوسٹ یا سروس کی ابتدائی تنخواہ ساڑھے چار سو یا پانچ سو روپے ہی ہوا کرتی تھی۔ سیب کا بھاؤ تو اس وقت مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوتا تھا مگر سونا ڈیڑھ سو روپے تولہ تھا اور وائٹ اوٹس (دلیہ) کا ڈبہ جس پر ایک بوڑھے انگریز کی تصویر بنی ہے جو کالے رنگ کا سولا ہیٹ پہنے بیٹھا ہے اس کی قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ تھی اور ہاں یاد آیا، ریڈرز ڈائجسٹ بھی ڈیڑھ روپے کا ملتا تھا۔

بہر حال اُس سستے زمانے میں بھی پانچ سو روپے تنخواہ پانے والا کوئی شخص کار خریدنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر اتفاق سے مجھے ایک ایسا محکمہ ملا تھا جس میں بطور کنٹونمنٹ ایگزیکٹو آفیسر، پہلی پوسٹنگ پر ہی کار خریدنے کے لیے بلا سود قرضے کی سہولت میسر تھی۔ نہ صرف یہ کہ کار کے لیے قرضے پر کوئی سود نہ تھا بلکہ کار خریدنے کے بعد محکمہ دو سو روپے ماہانہ کار الاؤنس بھی دیا کرتا تھا جس میں سے قرضے کی قسط نہایت آسانی سے ادا کی جا سکتی تھی۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر کنٹونمنٹ ایگزیکٹو آفیسر کے لیے لازمی تھا کہ وہ کار خریدے۔ اس زمانے میں سرکاری گاڑی میسر نہ تھی۔ سرکاری گاڑی صرف ڈی سی اور ایس پی کے پاس ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے وفاقی حکومت میں سیکرٹری کی سطح کے افسروں کے پاس کوئی سرکاری کار ہوتی ہو۔ قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے کہ جب وہ صدر ایوب کے پرنسپل سیکرٹری تھے تو اپنی ایک پھٹیچر سی کار میں ہی دفتر جایا کرتے تھے۔ اس کے شور کی شکایت ایک آدھ بار صدر نے بھی کی تھی۔

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ میں نے اپنے محکمے سے قرضہ لے کر ایک پرانی فوکس ویگن خرید لی جو خاصی اچھی حالت میں تھی۔ اُس زمانے میں فوکسی ویگن کا فیشن تھا، بالکل اسی طرح جیسے آج کل ٹیوٹا اور ہونڈا کا ہے۔ فوکس ویگن کے علاوہ اس وقت جو گاڑیاں عام مارکیٹ میں موجود تھی ان میں جرمنی کی اوپل اور انگلینڈ کی موٹرس تھیں مگر فوکس ویگن ایک پاپولر کار تھی پھر فوکس ویگن کو پسند کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے چکوال کی دو اہم شخصیات کرنل محمد خان (مصنف بجنگ آمد) اور جسٹس قاضی محمد گل کے پاس بھی فوکس ویگن تھی۔ جب میں کار خریدنے کے بعد خوشی خوشی کرنل محمد خان صاحب کو اپنی گاڑی دکھانے ان کے سرکاری بنگلے میں پہنچا تو انہوں نے میرے انتخاب کی داد دی۔ وہ فوکس ویگن کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ کہنے لگے کہ فوکس ویگن کو فوکسی کہا جاتا ہے یہ کسی جرمن حسینہ کا نام لگتا ہے۔ فوکسی تو بلکہ بڑی چنچل حسینہ ہے۔ اس کی دونوں فرنٹ سیٹیں اتنی آرام دہ ہیں اور گداز ہیں جیسے کسی حسینہ کی آغوش ہو۔ بیٹھتے ہی بدن میں سرور کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ ایسی مزے کی سیٹیں تو مرسیڈیز میں بھی نہیں۔ انہیں بکٹ سیٹیں کہتے ہیں۔ یہ اپنی آغوش میں جکڑ لیتی ہیں۔ کرنل صاحب کا یہ باذوق تبصرہ حقیقت پر مبنی تھا۔ فوکسی کے مقابلے میں باقی کاروں کی فرنٹ سیٹ میں وہ پکڑ کہاں جو آسودگی کا ایک احساس بھی پیدا کر دے۔

میں نے کرنل محمد خان صاحب کو اپنا تجربہ بتاتے ہوئے کہا کہ اس کار کو ڈرائیو کرنے کا لطف ہی اور ہے۔ اس کی پک اپ ایسی ہے کہ محسوس ہوتا ہے آپ گھڑ سواری کر رہے ہیں بلکہ آپ کسی مُنہ زور گھوڑے پر سوار ہیں جو تیز رفتاری میں آپ کی گرفت سے آگے نکلا جا رہا ہے۔

فوکس ویگن پر مری جاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے ہر چڑھائی پر اس کی رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہو۔ پہاڑ پر اُوپر جاتے ہوئے یہ اور اُوپر اٹھتی جاتی ہے۔ کسی اور کار کو آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ میں اس زمانے کی بات کر رہا ہوں جب ابھی جاپان اپنی نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ کار سازی کی صنعت میں داخل نہیں ہوا تھا۔ مگر میں کہتا ہوں اب بھی جاپانیوں نے فوکس ویگن جیسی کوئی سادہ اور ایزی کار نہیں بنائی ہے جس میں پانی ڈالنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ ریڈی ایٹر ہی نہ ہو۔ جس کا انجن کبھی گرم ہی نہ ہوتا ہو۔ انجن کو معتدل رکھنے کا سارا کام ہوا سے لیا جا رہا ہو۔ گرم لُو کے تھپیڑوں میں بھی انجن اتنا گرم نہ ہو کہ گاڑی روکنی پڑے۔ ہر طرح کے موسم میں بے تکان دوڑتی جائے......پھر اس کا انجن دیکھیں اتنا چھوٹا سا اور ہینڈی کہ ایک آدمی شاپر میں ڈال کر لے جائے اور مکینک پانچ دس منٹ میں اس کے چاروں پیچ کھول کر اُسے باہر نکال کر میز پر رکھ دے اور پھر ایک ایسا انجن جو سالہا سال تک چلتا رہے اور اسے کھولنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ کہتے ہیں فوکسی ہٹلر کی ایجاد ہے جسے اُس نے جنگ عظیم دوم میں بے آب و گیاہ صحراؤں میں دوڑنے کے لیے بنایا تھا جہاں نہ پانی ملتا ہے نہ مکینک۔ کاش ہٹلر اُس کار کی ایجاد کے علاوہ اور کوئی کام نہ کرتا۔

فوکس ویگن کے انجن کی بات ہو رہی ہے تو اس حوالے سے ایک دو لطیفے بھی بیان ہو جائیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس کا انجن کار کی پچھلی طرف ہوتا ہے جہاں دوسری کاروں کی ڈگی ہوتی ہے۔ غالباً اس سے پہلے کوئی ایسی موٹر نہیں بنی تھی جس کا انجن آگے کی بجائے پیچھے کی طرف لگا ہو۔ فوکسی جب سڑکوں پر نئی نئی نظر آئی ہوگی تو ظاہر ہے کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ

اس کا آگا پیچھے ہے اور پچھا آگے۔ اب تک موٹروں اور ریلی گاڑیوں کے بارے میں خاص و عام کا تصور یہی تھا کہ ان سب کا انجن آگے جڑا ہوتا ہے جو ان کو آگے کی طرف کھینچ کے لے جاتا ہے یہ خیال کسی کو نہیں تھا کہ ان کا انجن پیچھے بھی منڈھا جا سکتا ہے تانگہ اور بیل گاڑیوں اور گدھا گاڑیوں، سب کی صورت یہی تھی کہ گھوڑا یا بیل یا گدھا ان کے آگے باندھا جاتا ہے۔ یہ اب ایک بالکل غیر متوقع اور نئی چیز تھی کہ کسی کار کا انجن پیچھے اس کی دُم پر رکھا ہو جو گرمی کھا کر اور طیش میں آ کر پیچھے سے اُسے آگے کی طرف دھکیل رہا ہو۔

کہتے ہیں ایک سردار صاحب نے نئی نئی فوکس ویگن خریدی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے۔ چابی گھمائی۔ پھٹر، پھٹر انجن چلا اور سردار صاحب نئی کار کی ترنگ میں خوشی خوشی اسے لے کر مزے سے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے گھر لائے۔ دو تین دن بیوی بچوں کو اس نئی نویلی کار میں بٹھا کر شہر کی سیر کراتے رہے اور دیکھی بھالی سڑکوں پر پھٹ پھٹ دوڑتے پھرے۔ ایک صبح کسی دوسرے شہر جانے کا پروگرام بنا۔ اٹیچی کیس رکھنے کے لیے بزعم خویش کار کی ڈگی کھولی۔ ڈھکنے کا اٹھنا تھا کہ وہ یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے کہ ڈگی میں کار کا انجن لگا ہوا ہے۔ تب انہیں پتہ چلا کہ اچھا اس کار میں تو دو انجن ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے بھی انجن ہے اسی لیے تو یہ کار اس قدر تیز بھاگتی پھرتی ہے اور اس کی پک اپ عام کاروں سے زیادہ ہے۔ کیوں نہ ہو ایک ایک ہوتا ہے اور دو گیارہ۔

سردار صاحب نے اپنا اٹیچی کیس ڈگی میں رکھنے کی بجائے پچھلی سیٹ پر رکھ دیا کیونکہ ڈگی تو تھی ہی نہیں، سفر پر روانہ ہو گئے۔ ابھی شہر سے باہر نکلے ہی تھے اور تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سڑک کے کنارے انہیں ایک اور فوکسی کھڑی دکھائی دی۔ اس فوکسی کے مالک بھی خیر سے ایک سردار صاحب تھے جو پریشانی کے عالم میں کار کے پاس کھڑے تھے۔ سردار صاحب نے انہیں یوں پریشان حال دیکھ کر اپنی گاڑی روکی اور کار سے اُتر کر دوستانہ انداز میں ان سے پوچھنے لگے ''کیوں سردار صاحب! کیا بات ہے۔ کیا گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ میں آپ کی مدد کروں۔''

وہ بولا ''سردار جی! کیا بتاؤں۔ یہ جرمن لوگ بھی عجیب ہیں۔ ایسی کار بنائی ہے، جس میں انجن ہی نہیں ہے۔ کار انجن کے بغیر چل رہی ہے۔ میری گاڑی چلتے چلتے خود بخود رک گئی تو میں سمجھا انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ بونٹ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ انجن ہی نہیں ہے۔ میں حیران ہوں گاڑی چلتی کیسے رہی ہے۔

یہ صاحب بولے ''سردار جی۔ یہ جرمن لوگ واقعی عجیب و غریب ہیں۔ میری کار میں ایک کی بجائے دو انجن لگا دیے ہیں۔ کار کی ڈگی میں بھی ایک انجن لگا ہوا ہے اور آپ کی کار میں ایک بھی نہیں لیکن ان کم بختوں کی ٹیکنالوجی دیکھیں۔ آپ کی کار انجن کے بغیر ہی چل رہی ہے۔ واہ جی واہ۔

کرنل محمد خان صاحب کو فوکسی سے بڑی محبت تھی ،شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ فوکسی کسی لڑکی کا نام لگتا ہے اور پھر لڑکی بھی جرمن۔ کہتے ہیں جرمن لڑکی میں دنیا کی بہترین بیوی بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی لیے مصطفیٰ زیدی اپنی بیوی جرمنی سے لائے تھے وہ وہاں سے صرف فوکسی لانے کے قائل نہ تھے۔ انہیں زادِ راہ بھی میڈ اِن جرمنی چاہئے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ زندگی بھر اپنے اس زادِ راہ سے الجھتے رہے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں شہناز کی آغوش میں جا گرے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی کرنل محمد خان کی۔ فوکسی کی فرنٹ سیٹوں یعنی بکٹ سیٹس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے جسے کرنل صاحب کسی حسینہ کی نرم گرم مگر جکڑ لینے والی آغوش سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ مرحوم نے میری توجہ اس طرف بھی منعطف کروائی تھی کہ دیکھو فوکسی کی بتیاں دوسری کاروں مثلاً مرسیڈیز اور اوپل کی طرح اس کے ماتھے پر نہیں لگی ہوئیں بلکہ کسی حیا دار شرمیلی لڑکی کی طرح وہ اپنی آنکھیں (یعنی بتیاں) نیچے کئے ہوئے ہے۔ وہ کسی بے باک اور بازاری عورت کی طرح آپ کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈالتی۔ نہ آپ کے چہرے پر اپنی آنکھوں سے نکلنے والی شعاعوں کو گاڑتی ہے۔ آپ اس کے سامنے کھڑے ہو کر ذرا اس کی ہیڈ لائٹس دیکھیں آپ کو یوں لگے گا جیسے کوئی نیچی نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھ رہا ہے یا دیکھ رہی ہے۔ بے حیائی اور ہٹ دھرمی سے آپ کی آنکھوں میں آنکھیں نہیں ڈال رہی۔ فوکسی تو گویا بالکل شریف زادی لگتی ہے۔

فوکسی کی ایک اور خوبی جو کرنل صاحب کو بہت پسند تھی وہ تھی کسی پنکھے کے بغیر سواریوں تک ہوا کے جھونکے لانے کی اس کی صلاحیت۔ اس کے دروازوں کے بڑے شیشوں کے ساتھ آگے جو تکونی شکل کا ایک ایک چھوٹا شیشہ لگا ہوا ہے جسے ہوا کی ضرورت کے مطابق پورا یا آدھا کھولا جا سکتا ہے کار کے اندر بیٹھی ہوئی سواریوں کو کسی وقت بھی اور کسی موسم میں بھی حبس کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ کرنل صاحب کہتے تھے ان دریچوں سے ہوا اس طرح وافر مقدار میں آتی ہے جیسے کوئی آپ کے سامنے بیٹھا پنکھا جھل رہا ہو۔ پھر سخت سردی کے موسم میں اس کار کے اندر ہیٹنگ کا نہایت سادہ مگر نہایت موثر اہتمام ہے۔ اس زمانے میں ابھی کاروں میں اے سی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ شاید ایک ہزار میں سے کسی ایک کار میں ہو۔ البتہ سخت سردی میں ہیٹنگ کی جتنی عمدہ سہولت فوکسی میں ہے اس سائز اور قیمت کی دوسری کاروں میں نہ تھی۔ چنانچہ کسی کے پاس فوکسی کا ہونا گویا ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔

فوکسی کے چاہنے والے پیار سے اسے بی ٹل Beetle کہتے تھے۔ بی ٹل مکھی نما ایک ایسے کیڑے کو کہتے ہیں جس کی آنکھیں نیچے کی جانب ہوں اور جس نے اپنے سارے جسم کو مضبوط پروں سے ڈھانپ رکھا ہو۔ فوکسی بھی بالکل ایسے ہی ہے اس نے اپنے چاروں

پہیوں کو باہر کی طرف نکلے ہوئے مڈگارڈوں کے اندر اس طرح چھپایا ہوا ہے جیسے مرغی انڈوں کو یا چھوٹے چھوٹے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے، اسی لیے اس کے ٹائروں سے اُڑنے والی مٹی اس کی باڈی پر نہیں پڑتی۔ اس کے مڈگارڈز صحیح معنوں میں اسے مڈیعنی کیچڑ وغیرہ سے محفوظ رکھتے ہیں۔

اب فوکسی کے پہیوں کا بھی کچھ ذکر ہو جائے جن کا نعم البدل اس کلاس کی کاروں میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ ایک تو اس کے پہیئے سب کاروں کے پہیوں (ویلز) سے زیادہ بڑے ہیں۔ فوکسی کا سائز اور باڈی کار کی ہے مگر اس کے پہیئے اور ٹائر بس یا ٹرک کے لگتے ہیں۔ عام کاروں کا پہیہ دو دفعہ گھوم کر اتنا فاصلہ طے کرتا ہے جتنا فاصلہ فوکسی کا پہیہ ایک ہی جست میں طے کر جاتا ہے۔ مگر جست سے زیادہ اس کے پہیوں کی روڈ گرپ Grip اہم ہے۔ اس کے پہیئے سڑک کو جھپا ڈال دیتے ہیں۔ یہ کیفیت میں نے کسی اور موٹر میں نہیں دیکھی۔ اس کا مشاہدہ اس وقت آسانی سے کیا جا سکتا ہے جب سروس اسٹیشن والے گاڑی کو نیچے سے دھونے کے لیے اُوپر اٹھاتے ہیں۔ فوکس ویگن جب اس طرح اُوپر اٹھی ہوئی ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے چاروں پہیئے (ویلز) اندر کی طرف قدرے مڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس کے پہیئے دوسری گاڑیوں کے پہیوں کی طرح سیدھے ہوا میں معلق نہیں ہوں گے بلکہ ہر پہیہ نیچے سے اندر کی طرف قدرے مڑا ہوا نظر آئے گا اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کے پہیئے دوڑتے وقت گویا سڑک پر اپنے پنجے گاڑتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ پھر جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے فوکسی کے پہیئے دوسری کاروں کی طرح اس کی باڈی کے بالکل نیچے نہیں ہوتے بلکہ باہر کی طرف نکلے ہوئے ہیں اسی لیے اس کے مڈگارڈوں نے بھی اپنے پر پھیلا کر اور دونوں طرف سے باہر نکل کر اس کے پہیوں پر گویا سایہ کیا ہوا ہے۔ اس طرح عرض کے بل اس کے پہیوں کی درمیانی جگہ باقی کاروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے گویا چوڑائی کے لحاظ سے یہ زمین پر نسبتاً زیادہ پھیلی ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ فوکس ویگن کبھی اُلٹ نہیں سکتی۔ باقی کاروں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات ایکسیڈنٹ کی صورت میں سڑک پر اُلٹی پڑی ہیں۔ پہیئے آسمان کی طرف اور چھت زمین پر ٹکا ہوا مگر یہ صورت حال فوکس ویگن کو کم ہی پیش آسکتی ہے۔

اب کچھ تبصرہ اس کی شکل وصورت پر بھی ہو جائے۔ وہ جو چچا غالب کہہ گئے ہیں ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

یہ بیان اگرچہ طویل ہوتا جاتا ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو اور اس کے سراپا کی ساری خوبیوں کا تذکرہ کر دیا جائے۔ فوکسی کی شکل وصورت روزِ اول سے اب تک یا کم از کم جب تک ہر سال اس کے نئے نئے ماڈل آتے رہے ہیں ویسی ہی رہی ہے جس طرح اسے پہلی دفعہ بنایا گیا تھا۔ باقی تمام کاریں ہر نئے ماڈل کے ساتھ تبدیل شدہ اور نئی نئی شکل و صورت میں ظاہر ہوتی رہی ہیں مگر فوکسی نے اپنی شکل وصورت اور خدوخال کبھی نہیں بدلے۔ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ گزرتے وقت نے اس کے خدوحال اور چال ڈھال پر کوئی اثر ہی نہیں کیا۔ اس کا روپ ہمیشہ ترو تازہ رہا ہے اس کی دل آویزی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ آج بھی یہ اُسی سج دھج کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے جس سج دھج کے ساتھ آج سے ساٹھ سال پہلے گویا یہ ایک الہڑ مٹیار کی مانند ہے جس کے جوبن کو زوال نہیں۔ نہ ہی اسے مشہور فلمی اداکاراؤں اور ماڈل گرلز کی طرح بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی پلاسٹک سرجری سے اپنے چہرے مہرے کے خدوخال کو نیا رنگ روپ دینے کی کوئی ضرورت ہے۔ دوسری کاروں کے نت بدلتے فیشن اس کے لیے قابلِ رشک نہیں یہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل وصورت میں ہی سرمست وخراماں ہے اور پھر رپھر ر پھٹ پھٹ کرتی فراٹے بھر رہی ہے۔ اس کی یہی ادا تو دل میں اُس فوکسی کی یاد تازہ کر دیتی ہے جس کی محبت ہم اپنی جوانی میں گرفتار ہوئے تھے۔

زندگی بھر کے مختلف تجربات کے گونا گوں مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری ہر اچھی چیز کو نظر لگ جاتی ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی ہے یہی کچھ ہماری پیاری فوکسی کے ساتھ ہوا بلکہ ہمارے ساتھ ہوا۔ ایک دن شومئی قسمت سے کچھ غرض مندوں یعنی ہمارے بدخواہوں کی نظر ہماری فوکسی کے چمکتے دمکتے روپ پر ایسی پڑی کہ اسے پلک جھپک میں ہم سے اُڑا کر لے گئی۔ حالانکہ اسے بیچنے کی مجھے ہرگز کوئی ضرورت نہیں تھی نہ ہی کوئی ایسی خواہش تھی کہ اسے بیچ کر کسی اور نسل کی کار لی جائے۔ بس یہ سب کچھ بغیر سوچے سمجھے اچانک ہو گیا۔ دو نوجوان یونیورسٹی کے طالب علم میرے پیچھے پڑ گئے کہ آپ کی فوکسی ہمیں بہت پسند آئی ہے خدا کے لیے ہمیں دے دیں۔ حالانکہ وہ خدا کے لیے نہیں بلکہ اپنے لئے مانگ رہے تھے۔ یہ 1971ء کی کوئی منحوس گھڑی تھی کہ بے خیالی میں ان لوگوں کی باتوں میں آکر میں نے اپنی فوکسی ان کے ہاتھ بیچ دی۔ اس کے بعد اب تک کئی کاریں خریدیں اور فروخت کیں مگر کسی کار کی جدائی ایسی شاق نہیں گزری جیسی فوکسی کی۔ ہم بعض اوقات بغیر کسی اشد ضرورت کے اپنے اثاثے فروخت کر دیتے ہیں اور پھر عمر بھر ہاتھ ملتے رہتے ہیں شاید آپ ایسا نہ کرتے ہوں مگر میں اتنا عقلمند اور دور اندیش نہیں ہوں۔ آج بھی کوئی فوکسی سڑک پر فراٹے بھرتی نظر آجاتی ہے تو دل مچل اٹھتا ہے۔

❀❀❀

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

(غالبؔ)

ادب اور زندگی

پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن

کرۂ ارض پر بسیرا کرنے والی تمام مخلوقات میں سے افضل ترین انسان ہے۔ یہ کائنات کی مرکزی اکائی ہے۔ خالق کائنات نے اس شاہکار تخلیق کو لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ کہہ کر مہر تصدیق ثبت کردی اور وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ فرما کر تخلیق کی غرض وغایت بھی واضح کر دی۔ اپنے کردار کے جائزے اور احتساب کے لیے انسان کے اندر ایک کسوٹی رکھ دی جو خیر وشر کے ترازو میں عقل و دانش کے معیار پر آپ کی شخصیت کو پرکھتی رہتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فہم و شعور نے انسان کو دوسری مخلوق پر اپنی برتری کا احساس دلایا اور اپنی زندگی کو بہتر انداز میں گزارنے کا سلیقہ دیا۔ حسن و زیبائش کا فن سکھایا۔ فکر وتدبر سے تسخیر کائنات کے گر سکھائے۔ اپنی خواہشات کے بے لگام جذبات کو فن لطیف کی تہذیب سے سنوارنے کا شعور دیا۔ یوں علم و فنون کی کہکشاں نظر آنے لگی اور ادب کی اہمیت کا احساس پیدا ہونے لگا۔

ہر عہد کے تقاضے اور ترجیحات مختلف ہونے کے باوجود انسان اپنے وجود کی حفاظت اور زندگی کی بقاء کے بنیادی اصول سے غافل نہیں رہا۔ مرور ایام میں اس کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ یونانی دیومالائی طرزِ فکر میں طاقت کو سرچشمۂ حیات تصور کیا جاتا۔ جسم و جان کو متوازن رکھنے کے لیے برہنہ کشتی (Naked Bouts) کا اہتمام کیا جاتا تا کہ دماغ اور بدن کی تندرستی کا جائزہ لیا جا سکے۔ اس دور میں ادبی تخلیق کی مرکزیت عموماً طاقت کی علامت ہوا کرتی۔ اسلام کے ظہور کے بعد ادب میں اخلاقیات کا مذہبی رنگ نمایاں نظر آنے لگا۔ یورپی تمدن کی روشنی نے انسانی زندگی کے کئی تاریک گوشوں کو منور کیا۔ ایسے نظریات کی تشکیل ہونے لگی جو وقتی چیلنجز کا جواب ہونے کے باوجود دوسرے کئی مسائل کو جنم دیتے۔ مثلاً Naturalism کی سائنسی تحریک نے انسانی کردار کی تفہیم کی خاطر انسان کو فطرت کی دوسری اکائیوں کے مساوی لا کھڑا کیا کہ علت ومعلول کا قانون دیگر مظاہر فطرت کی طرح انسان پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ یوں انسان کی ''برتری شعور'' کا سومنات پاش پاش ہوگیا۔ بطورِ ردِعمل Idealism وجود میں آیا۔ پھر جلد ہی اس کی اصلیت بھی سامنے آ گئی۔ اس کے اثرات بھی انسان کے ''احساسِ تفاخر'' کو قائم نہ رکھ سکے اور ''وجودیت'' کا تصور پچھلی نصف صدی پر چھا گیا۔ وجودی ادب کی مقبولیت میں اس کی Universal Apeal کو دخل ہے۔ میرے خیال میں عظیم ادب یا Higher Literature کا کمال یہ ہے کہ حالات کے بدلنے کے باوجود وہ ہر دور میں زندہ وتوانا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت دم نہیں توڑتی۔ جب کہ کسی تحریک یا وقتی مزاحمت کے زیر اثر تخلیق شدہ ادب حصول مقصد کے بعد بے معنی ہو جاتا ہے۔

بیسویں صدی کا عظیم ادب زیادہ طور اثباتیت، علامتیت، تصوریت، تصوف، جنسیت اور وجودیت وغیرہ کے زیر اثر پروان چڑھا۔ بلاشبہ یہ نظریات زندگی کو ایک خاص ڈھب سے گزارنے کا سلیقہ دیتے ہیں۔ یہ علمی نظریات ہیں اور فلسفۂ حیات کی بھٹی سے کشید ہوتے ہیں۔ درحقیقت فلسفہ، نفسیات، سائنس اور مذہب نے زندگی کے روپ کو ہمیشہ نکھار بخشا ہے۔ ادب کو متمول کیا ہے اور ثقافت کے نمو کا باعث بنے ہیں۔ جب کہ ادب اور آرٹ ثقافت کو منعکس کرتے ہیں، فلسفہ اور ادب اقدار کا تعین کرتے ہیں۔ ادب اقدار کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یوں ادب اور دیگر علوم زندگی میں اقدار کے احیاء اور تزئین کے مسلک سے منسلک ہیں۔ فلسفہ صرف ان نظریات سے راہنمائی حاصل کرتا ہے جو اقلیم دانش کی میراث ہیں۔ جب کہ مذہب زندگی کو الٰہیات کے توسط سے مزین کرتا ہے۔ اس لیے تمام ادبی رُجحانات بالواسطہ علوم وفنون کی دین ہیں اور زندگی کو ایک مثبت سمت کی جانب راہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

ادب کا تعلق کسی نظریے کی ترویج وتشہیر سے نہیں۔ اقلیم ادب کسی حدود کے تعین کا محتاج نہیں۔ کسی چار دیواری میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ ادب کے سوتے کسی اصناف سخن کے پابند نہیں۔ ادبی اصناف فروغِ ادب کا باعث ہیں لیکن ادب کی اہمیت اصناف سے نہیں بلکہ اس میں پنہاں دانش سے ہے۔ ہر ادبی تخلیق جو نئے احساسات کو جاذب انداز میں یا اچھوتے اسلوب میں پیش کرے، ادب کا حصہ ہے۔ ایسی تحریر جو کسی موضوع یا ندرتِ خیال کو پیش کرے جس میں فکر و دانش کے موتی کی چمک نظر آئے ادب پارے کا جزو قرار دی جا سکتی ہے۔ علوم وفنون کی ترقی کے باعث اب ادب کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ تمام علوم وفنون اس کے دامن میں سمٹ آئے ہیں۔ تمام نامیاتی بلکہ طبعی اور تجرباتی علوم بھی اس کی پناہ میں ہیں۔ جدید میڈیکل سائنسز میں اعضاء کی پیوندکاری کے تجربات

نے انسان کی سائیکی اور شخصیت بدل دی ہے۔ دل و جگر کی پیوند کاری اور آنکھوں کی بصارت کے کرشموں کے باعث انسان کی قلب ماہیت نے ادب میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ نئے رجحانات اور نئے نظریات کی تخلیق نے ادب میں ایک نیا جہان پیدا کر دیا ہے۔ یہ سفر جاری وساری ہے۔ ادب کا دامن وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور ذہنی سوچ کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ تعین کے امکانات کی زد میں نہیں، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ ہر دن کا نیا سورج نئے پیغامات کی نوید لاتا ہے۔

جس طرح ادب کو کسی نظریے کی ترویج وتشہیر سے وابستہ یا منسلک نہیں کیا جا سکتا بعینہٖ عظیم ادب یا حقیقی ادب کسی ادارے، تحریک یا مخصوص سماج کا ترجمان نہیں بن سکتا۔ ادب فکری سطح پر اعلیٰ اقدار کا نمائندہ تصور ہوتا ہے۔ تہذیب وتمدن، فکری آزادی، رواداری، عزت نفس، خودداری اور عدل ومساوات کی شمع روشن رکھتا ہے۔ جہالت، خوف اور گمراہی کے اندھیرے دور کرتا ہے۔ زندگی کی حقیقت پیش کرتا ہے۔ ادب انسانیت میں صرف قوت خیر کی جھلک پیش کرتا ہے اور بے جھجک کرتا ہے۔

بدقسمتی سے وطن عزیز میں ایک نئی روش نے جنم لیا ہے اور ادب "طاقتور سہاروں" کا محتاج بن چکا ہے۔ ریاستی اور سماجی اداروں کی سرپرستی میں ادب پنپنے لگا ہے۔ کچھ لوگ اپنی "فلاح و بقاء" پر پھولے نہیں سماتے۔ حقیقی ادب اب پیدا نہیں ہوتا۔ شاید اس کی ضرورت اور افادیت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ صحافت نے رہی سہی کسر نکال دی ہے۔ وہ عزت، شہرت اور دولت کے ایسے منہ زور گھوڑے پر سوار ہے کہ علم اور ادب کے پرستار اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ وہ معاشرے کے ٹھیکیداروں کی محلاتی سازشوں کا شکار ہو کر کنج عافیت میں منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔ زندگی کی آسائشوں کے دروازے ان پر وا نہیں ہوتے۔ البتہ بے معنی، بے مقصد، نمائشی اور اشتہاری ادب مخصوص اداروں کی چھتری کے زیر سایہ خوب فروغ پا رہا ہے۔ انعام واکرام کی بارش بنجر زمین کو بھی سیراب کر دیتی ہے۔

ہمارے نام نہاد نقادوں کی تیر اندازیاں اور قلابازیاں اپنی کم علمی کو کیموفلاج کرنے کے لیے تمسخر آمیز فقرے بازی کو تنقید نگاری سمجھتے ہیں۔ اختلاف رائے رکھنے والے افراد پر سنگ باری کے شغل کو ادب کے فروغ کا باعث قرار دیتے ہیں...... "ادیبوں کے ناموں کی فہرست بنا کر جنرل مرچنٹ کی دکان کی طرح الگ الگ شیلف میں سجا دیتے ہیں۔ ادبی اصناف کے خود وضع کردہ ادبی چوکھٹوں کے فریم میں اپنے پسندیدہ ادیبوں کی تصویریں نمائش کے لیے رکھ دی جاتی ہیں۔ اس طرح ادارے کے ادبی ٹولے کی خوب Projection ہو جاتی ہے۔ یوں انا کی تسکین کے ساتھ ساتھ "سامانِ تسکین" بھی فراہم ہونے لگتا ہے۔ ان کی تنقید میں بہت کچھ ہوتا ہے، مگر تنقید نہیں ہوتی۔ مصلحت اندیشیاں، دوستانہ رواداریاں اور مخالفانہ تیر اندازیاں ہوتی ہیں۔" عملی تنقید یا Practical Criticism کے لیے کسی ادیب پر کام کرنا پڑتا ہے جس کے لیے نقاد کو اپنے علم کو تازہ اور قلب ونظر کو وسیع کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ یہ مرتبہ بلند ہر مدعی کو عطا نہیں ہوتا۔ خصوصاً انہیں ہرگز عطا نہیں ہوتا جو دوسروں کی تضحیک کو اپنی تنقید نگاری کا جوہر قرار دیتے ہیں۔

ابتدا ہی سے تنقیدی نکتۂ نظر اختیار کرنے کے متعلق استادِ محترم پروفیسر ڈاکٹر سی-اے قادر کا ارشاد ہے:

"Abondon the attitude of a critical scholar from the very beginning while studying the books ...... rather assume the view point of a lover or a true admiror because truth is better revealed in that way......"

بلاشبہ کسی ادب یا فن پارے کے پس پردہ تخلیق کار کی نفسیاتی کیفیات تک تنقید نگار کی رسائی تجزیاتی تفہیم کے لیے ضروری ہے۔ اپنے ذہن میں پہلے سے قائم شدہ نظریاتی عوامل کے زیر اثر تنقید کی حیثیت ایک ذاتی قسم کے تبصرے کے سوا اہمیت نہیں رکھتی۔ اس کی ایک تازہ مثال الحمراء میں "اپنا گریباں چاک" پر ایک صاحب کا تنقیدی مراسلہ ہے۔ جس میں موصوف مورچہ بند ہو کر اپنے ٹارگٹ پر تیر برسا رہے ہیں۔ پوری تحریر ذاتی مؤقف کی تصویر کے سوا کچھ نہیں۔ Hazellet نے خوب کہا تھا:

"A writer should never appear in slippers and gowns......"

"لوگ تخلیق کی بجائے تخلیق کار کی شخصیت پر برسنا شروع کر دیتے ہیں یا پھر عقیدت کے پھول برسا کر پرستش کرنے لگ جاتے ہیں۔"

بلاشبہ تنقید نگاری اقلیم ادب کی ایک امتیازی صنف ہے جس کے باعث معیارِ فن کا توازن قائم ہے اور وجودِ فن کی بقاء برقرار ہے۔ میرے خیال میں ادب کو نام نہاد ماہر نقادوں کے گروہ کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنا بھی خدمت ادب کے زمرے میں آتا ہے۔

پاکستانی معاشرے کا خلفشار اور ادیب کا کردار

مسعود مفتی

آج مجھے جو موضوع دیا گیا ہے اس کی مناسبت سے یہ تحریر تو نئی ہے مگر خیالات میری پرانی تحریروں کی کشید ہیں۔ اس لیے کوئی حرج نہیں اگر آغاز میں ہی اختتام بھی بتا دیا جائے کہ ہمارے معاشرے کا خلفشار قابل فہم ہے اور ایک حد تک مایوس کن ہے۔ مگر ہمارے ادیب کا کردار نا قابل فہم ہے اور بے حد مایوس کن ہے۔ اتنا کہ اقبال کی روح بھی تڑپ رہی ہوگی کہ کیا واقعی

ع شاعر رنگین نوا ہے دیدۂ بینائے قوم

اس مرکزی خیال کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس خلفشار کی نوعیت یا کیمسٹری (Chemistry) سمجھ لیں۔ میری حقیر سوچ کے مطابق یہ خلفشار دراصل اس تہہ در تہہ زنگ کے اُکھڑے ہوئے ٹکڑے ہیں جو مسلم اُمہ کے دل و دماغ پر اتنے عرصہ سے جم رہا تھا کہ علامہ اقبال نے اجتہاد والے چھٹے لیکچر میں اسے "پانچ صدیوں کا جمود" قرار دیا۔(۱) اس جمود سے پہلے مسلم اُمہ کے فکر و عمل میں لوہے جیسی مضبوطی تھی۔ مگر جمود کے بعد اس کے ڈھانچے میں صرف کھوکھلانا ہے۔ اس لیے یہ زنگ سائنس کی اصطلاح والا Iron Oxide نہیں بنتا بلکہ نفسیاتی بیمار والا Self Oxide بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہم ہر دم اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنی برادری، اپنے قبیلے یا اپنے مسلک کی بالادستی چاہتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسلم فرد کی ساری عبادت اپنی ذات کی بخشش کے لیے ہے اور مسلم بادشاہ کی ساری ریاضت اپنے خاندان کے موروثی اقتدار کے لیے ہے۔

اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مگر میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سنہ ۱۳۰۰ء کے آس پاس حقوق اللہ والے مسلمان نے اجتہاد کا دروازہ ایسے دھڑاک سے بند کیا کہ حقوق العباد والے مسلمان باہر ہی رہ گئے۔ سوال اور سوچ خارج از اسلام ہو گئے۔ ابن خلدون، البیرونی، ابنِ رُشد اور دیگر مسلم فلسفیوں کی بالغ نظری دم توڑ گئی اور سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ ریاستی احتساب بھی پامال ہو گیا۔ تاریخ گواہ ہیں کہ ایسی ہی فضا میں ذاتی مفادات قومی مفادات سے افضل ہو جاتے ہیں۔ ذات ریاست پر حاوی ہو جاتی ہے اور حب الوطنی میں غداری کی دیمک لگ جاتی ہے۔ یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں، جو کسی بھی زمانے میں خلفشار اور انتشار کی کیمسٹری بن جاتے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان سب سے بڑی اسلامی ریاست کے طور پر اُبھرا۔ تو فوراً ہی اس جمود زدہ اسلامی زنگ کی لپیٹ میں آ گیا اور اپنی ذات، اپنا خاندان، اپنی برادری، اپنا قبیلہ اور اپنا مسلک نئی ریاست پر حاوی کرنے کی دوڑ لگ گئی۔ شروع سے ہی تین کھلاڑی اس دوڑ میں شریک پائے گئے۔

پہلا کھلاڑی اس تیزی میں تھا کہ خود قائداعظم کو دھکا مارتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ قائداعظم کے احتجاج کی گونج ان کی تقاریر کے مجموعے کے صفحہ ۲۶۵ پر ہے۔(۲) ۱۴ جون ۱۹۴۸ء کو سٹاف کالج کوئٹہ کی تقریب میں آرمی افسران سے گفتگو میں قائداعظم کا ماتھا ٹھنکا تو اپنی تقریر میں تبدیلی کرتے ہوئے انہوں نے فوری طور پر فوجی افسروں کی توجہ ان کی ملازمت کے حلف نامے کی طرف دلائی اور یاد دلایا کہ آئین کے تحت وہ صرف اور صرف گورنر جنرل کی سویلین اتھارٹی کے ماتحت ہیں۔ مگر قائداعظم ستمبر ۱۹۴۸ء میں فوت ہوئے تو چند ہی ماہ بعد بریگیڈیئر اکبر خان نااہل اور کرپٹ سویلین حکومت پر فوجی قبضے کے لیے رابطے کر رہے تھے۔(۳) جنوری ۱۹۵۱ء میں جنرل ایوب خان کمانڈر ان چیف بنے تو اکبر خان میجر جنرل بن کر ان کے چیف آف جنرل سٹاف بن گئے۔ ان کے گھر میں منعقدہ میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ چار مارچ ۱۹۵۱ء کو جب وزیر اعظم اپنی کابینہ سمیت راولپنڈی آئیں تو ان سب کو گرفتار کر کے حکومت کا تختہ اُلٹ دیا جائے۔(۴) مگر بات باہر نکل گئی۔ فروری کے مہینے میں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتاریاں ہوئیں اور اسی برس اکتوبر کے مہینے میں وزیر اعظم لیاقت علی خان قتل ہو گئے۔ قاتل تو وہیں مارا گیا مگر قتل کروانے والوں کا سراغ آج تک نہیں ملا۔

اس دوڑ کے دوسرے کھلاڑی وہ وڈیرے تھے جنہیں قوم کی غلامی کی زنجیریں مضبوط کرنے کے عوض بیرونی حاکموں کی طرف سے قریباً ایک صدی اور تین نسلوں تک جاگیریں، مراعات اور بالانشینی ملتی رہی۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں وہ اسمبلیوں پر قابض ہو گئے۔ انگریز گئے تو تخت پر قابض ہو گئے اور پھر اس قبضے کو دائمی بنانے کے لیے وہ ہر غلط ہتھکنڈہ استعمال کرنے لگے۔ چنانچہ نئے ملک کا نیا آئین بنانے کو اس کامیابی سے روکا کہ پہلے سات برس میں دستور ساز اسمبلی کی تمام میٹنگوں کا مجموعی دورانیہ نصف برس سے زیادہ نہ تھا(۵) اور آئین کا دور دور بھی پتہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ انگریز کی محافظ چھتری ہٹ جانے کے بعد انہیں ایک طاقتور ساتھی کے دست شفقت کی ضرورت تھی۔ اس لیے ۱۹۵۴ء میں کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان کو ڈیفنس منسٹر بنا دیا گیا اور قومی کابینہ میں ایک باوردی

وزیر شامل کرنے کی نئی رسم ڈالی گئی۔ اپنی کتاب Friends not masters میں جنرل ایوب نے لکھا ہے کہ انہوں نے اسی وقت اپنی منصوبہ بندی شروع کردی اور ۱۹۵۴ء کے بعد ملک میں جو کچھ ہوا وہ انہی کے منصوبوں کے مطابق ہوا۔ اس طرح ان دو کھلاڑیوں کے متحدہ Self Oxide نے اس نئے ملک پر اپنا تسلط جمالیا۔

اس دوڑ میں شریک تیسرا کھلاڑی جب خود کو ''علمائے کرام'' کہتا تھا تو علامہ اقبال حیرت سے پوچھتے تھے ع ابلہ دنیا ہے کیوں دانائے دیں.....مگر نادان قوم انہیں بدستور دانا کا رتبہ دیتی رہی۔ یہ کھلاڑی قریباً ایک صدی تک انگریز کی خفیہ ایجنسیوں کی معاونت کرتا رہا۔ آخری وقت تک پاکستان کے مطالبے کی مخالفت کرتا رہا اور جمعیت العلمائے ہند کے مولانا حسین احمد مدنی کے فتوے کی حمایت میں قائداعظم کو (اللہ نہ کرے) ''کافر اعظم'' کہتا رہا(۶)۔ حتیٰ کہ پاکستان قائم ہوا تو اسے قومی تحریک کی منزلِ مقصود نہ کہا بلکہ مملکت خداداد کہا تا کہ خدا کا یہ خود ساختہ ٹھیکے دار اس پر اپنا حق جما سکے۔ چنانچہ خیمے میں گردن ڈالنے والے اونٹ کی طرح یہ ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد (Objective Resolution) پاس کروانے میں کامیاب ہوگیا۔ بغیر اس وضاحت کے کہ آیا یہ خلافت راشدہ، اقبال اور جناح کے سماجی انصاف والا اسلام ہوگا یا ''دینِ ملائی سبیل اللہ فساد'' والا اسلام ہوگا۔ اسی لیے مولانا حسرت موہانی نے فوراً کہا(۷) کہ اللہ کی حاکمیت کے ارفع نظریہ کا سہارا لینے والے دراصل بے ایمانی کر کے زمین پر کوئی خود کار آئینی ڈھانچہ یا آئین نہیں بنانا چاہتے۔ کیونکہ آئین زمان و مکان کا پابند ہوتا ہے اور اللہ کی حاکمیت والا ارفع نظریہ زمان ومکاں سے ماورا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ اللہ کی حاکمیت کے نام پر اپنی سرداری قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بعدازاں جنرل ضیاء کی نیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس لیے انہوں نے پورے اونٹ کو خیمے میں داخل کر لیا اور فوجی اعزاز کے ساتھ جُبہ و دستار پہنا دیے۔

یہ واقعات صاف ظاہر کرتے ہیں کہ پاکستان کے پہلے دو برسوں میں ہی ان تین کھلاڑیوں کی Self Oxide والی دوڑ شروع ہو چکی تھی جو بعد میں مُلا، ملٹری ڈکٹیٹر، وڈیرہ'' گٹھ جوڑ کی شکل میں ایک مضبوط ''اتحاد ثلاثہ'' بن کر اُبھری۔ مگر اس مشترکہ ٹیم کی بنیاد ۱۹۴۷ء میں ہی پڑ چکی تھی۔ جس نے اپنا بدنیتی کا کھیل نئی ریاست کے آغاز میں ہی عین اس زمانے میں شروع کر دیا۔ جب نیک نیت اور پُرخلوص نوجوان فضل محمود، حفیظ کاردار، خان محمد، امتیاز اور شجاع الدین وغیرہ اس نئی قوم کو کرکٹ کے آسمان پر لے جارہے تھے۔ مگر المیہ یہ تھا کہ اس اتحاد ثلاثہ کی قبضہ اننگ تب سے اب تک ختم ہی نہیں ہوئی۔ قوم صرف فیلڈنگ کرتی رہی۔ مگر آج تک ان میں سے کسی ایک کو بھی آؤٹ Out نہیں کرسکی۔ کیونکہ اطاعت گزار بیٹ، لنگڑے بال اور فرماں بردار وکٹ یہ خود ہی بناتے ہیں۔ ایمپائر ان کے اپنے مقرر کردہ ہیں۔ کھیل کے عجیب وغریب قوانین یہ خود بناتے ہیں جن کی دنیا بھر میں مثال نہیں ملتی۔ جیسے NRO اور NAB کے قوانین(۸) اسمبلی والے کھلاڑی کو ترقیاتی فنڈز کے قوانین، سرکاری ملازموں کی سیاسی چاکری کے قوانین اور ہر وہ قانون جس سے ان کا اور صرف ان کا کھیل جاری رہ سکتا ہے۔ ان قوانین کے علاوہ دھونس بھی ان کی اور دھاندلی بھی ان کی۔

دراصل ہمارے عوام کے سیاسی خلفشار کی اندرونی کیمسٹری Chemistry ہی یہی ہے اور اسی مایوسی، ناکامی اور محرومی سے بنی ہے کہ اتحاد ثلاثہ کی اننگ Inning ختم ہونے اور ان کی اپنی اننگ شروع ہونے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی۔ خصوصاً جب اس اتحاد کا اپنا تراشا ہوا کرکٹ بورڈ میچ فکسنگ (Match Fixing) کے ہتھکنڈوں سے بدامنی، لاقانونیت، فرقہ واریت، لوڈ شیڈنگ Load Shedding کرپشن اور مہنگائی کو بڑھا کر اس خلفشار میں مزید اضافہ کرتا جاتا ہے۔ تاکہ قوم نہ تو صحیح انداز میں باؤلنگ Bowling کر سکے۔ نہ دل جمعی سے کوئی کیچ (Catch) کر سکے اور نہ رن آؤٹ Run out کے لیے صحیح نشانہ لگا سکیں۔ سوائے ایک نشانے کے جس میں شہریوں کی اپنی ہی خودکشی یا خودسوزی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ قومی خلفشار جاری رہتا ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک اس تین ٹانگوں والے پیرتسمہ پا سے نجات نہیں ملتی۔

یہ صورتِ حال ہماری تواریخ کا صرف ایک ہی رخ پیش کرتی ہے۔ جو بدنیت کھلاڑیوں کے اپنے قانون کے تابع رہا۔ مگر اس تواریخ کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ جو کائنات کو چلانے والے خدائی قانون کے تابع ہے۔ وہی خدائی قانون جو تازہ کاٹی ہوئی گیلی اور کمزور لکڑی پر دھوپ، بارش، سردی، گرمی، آندھی اور طوفان کے تھپیڑے مار مار کر اس کی اس حد تک پختہ کاری یا سیزننگ (Seasoning) کرتا ہے کہ یہ بلند و بالا عمارتیں کھڑی کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ چھ صدیوں سے مسلم اُمہ کے مسلسل جمود کا المناک منظر دیکھنے والا خدا اقبال کی آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی بھی سنتا رہا تھا کہ

حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ اُمت خرافات میں کھو گئی

اس لیے خدائے تعالیٰ کو خوب اندازہ تھا کہ

قائداعظم کی فہم وفراست ایک نیا ملک تو حاصل کرے گی مگر صدیوں پرانے زنگ خوردہ Self Oxide سے کھوکھلی قوم اسے چلا نہیں سکے گی۔ اس لیے اسے ویسی ہی Seasoning کی ضرورت ہے۔ جیسی اس برعظیم میں ہندو قوم کی 1947ء سے پہلے ہو چکی تھی۔ جب انہیں عرصہ دراز تک بیرونی حاکموں کی مسلسل غلامی میں رکھا گیا۔ چنانچہ پاکستانیوں کی Seasoning 1947ء کے بعد شروع ہوئی۔ جس کے لیے انہیں اندرونی اتحادِ ثلاثہ کی مسلسل غلامی کے حوالے کر دیا گیا اور اب نصف صدی کی پختہ کاری کے بعد ہماری قوم صرف اس قابل ہوئی ہے کہ شیر خوار بچے کی طرح لڑکھڑاتی چال چل سکے اور توتلی زبان سے اظہارِ مدعا کر سکے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ پختہ کاری کی اس نصف صدی میں حاکموں کا جور و استبداد بتدریج بڑھتا رہا پہلے ترقی پسند تحریک پر پابندی۔ پھر نیشنل پریس ٹرسٹ کے قیام سے قلم کی چال پر کنٹرول۔ پھر سیفٹی ایکٹ اور قلعہ اٹک کی کال کوٹھڑی۔ اگلے مرحلے پر قومی ترانوں کے ساتھ کوڑے اور بالآخر لاپتہ افراد۔ پہلے چند ایک پھر ہزاروں مگر ساتھ ہی ساتھ اس مظلوم و مقہور قوم کی سیزننگ (Seasoning) میں بھی بتدریج یہ مدارج دیکھنے میں آئے کہ پہلے قلم کا ڈھکا چھپا احتجاج پھر سرگوشیاں پھر زیرِ لب تبصرے، پھر بلند نعرے، جلسے جلوس، آزاد عدلیہ کے لیے وکلاء اور قوم کی تحریک اور بالآخر دھرنے یعنی انفرادی دھرنے، اجتماعی دھرنے اور بادو باراں کے طوفان میں دھرنے۔ اسی دوران میں سپریم کورٹ، میڈیا اور سول سوسائٹی کی طرف سے وڈیروں اور خفیہ اداروں کی نجی جیلوں پر اس طرح انگشت نمائی ہونے لگی کہ پچھلے تین چار برس میں خیر و شر کے درمیان کھلی جنگ چھڑ گئی۔ جو اس خلفشار کی موجودہ شکل ہے۔

اس جنگ کا آئندہ نتیجہ تو خدا ہی جانے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں ہمارے ادیب نے نہ تو قوم کی Seasoning کے عمل میں ہاتھ بٹایا اور نہ ہی اب خیر و شر کی اس جنگ میں شامل نظر آتا ہے۔ سوائے تین چار بکھری ہوئی انفرادی آوازوں کے جن میں سے ایک تو فیض احمد فیض کی دھیمی مگر مسلسل آواز ہے۔ دوسری حبیب جالب کی پرشور اور ہیجان انگیز آواز ہے اور تیسری احمد فراز کی سدا بہار رومانی آواز میں سے کبھی کبھار اُبھرنے والی احتجاجی دہائی ہے۔ چوتھی مثال احمد ندیم قاسمی کی ہے۔ جن کی آواز اور عمل دونوں ہی اپنے اپنے وقت پر سنجیدگی اور سلیقے سے بولتے رہے۔ احتجاج تو دیگر ادیبوں نے بھی کیا ہے۔ مگر اتنے محتاط انداز میں کہ وہ کسی کے کان کھڑے کر دینے والی آواز نہ بن سکے۔ جب تکیے میں منہ چھپا کر روئیں تو احتجاج کیسا؟

ع ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور......

ان کے علاوہ مزاحمتی ادب کے نام پر موٹے موٹے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں لیکن ان میں شر کے خلاف خیر کی اصولی اور آفاقی مزاحمت نہیں ہے۔ بلکہ ایک سیاسی پارٹی کے ادیبوں کی اپنی مخالف سیاسی پارٹی پر تو نقطہ چینی ہوتی ہے۔ مگر اپنی سیاسی پارٹی کے ویسے ہی طرزِ عمل پر وہ بالکل خاموش اور لاتعلق رہتے ہیں۔ ایسے مزاحمتی ادب کا قاری صرف یہی کہہ سکتا ہے کہ

ع تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

آج کی اس محفل میں جو چند چہرے میرے ہم عمر ہیں انہیں یاد ہوگا کہ موجودہ قومی خلفشار سے پہلے کارخانہ پاکستان کا سنہری دور تھا۔ کہنے کو تو بقولِ غالب ہمارے گھر میں بوریہ بھی نہ تھا۔ مگر اس بے آب و گیاہ ویرانے میں ہی قوم نے چند برسوں میں گلشن مہکا دیے۔ ریلوے قابلِ فخر ادارہ بن گئی۔ پی آئی اے پیدا ہوا تو مختصر ترین بچپن کے بعد ایک جوان رعنا بنا کہ دوسرے ممالک میں جا کر کئی فضائی کمپنیوں کو جنم دیا۔ یہی معجزہ بینکاری نے دکھایا۔ واپڈا کا جوشِ نمو دیکھ کر ورلڈ بنک اسے سلام کرتا تھا۔ تھل کے تپتے صحراؤں میں گلزارِ ابراہیم کی طرح جوہر آباد اُبھر آیا۔ گلیوں میں کھیلنے والے کرکٹ اور ہاکی کے عالمی آسمان پر تارے بن کر چمکنے لگے اور سکولوں میں ٹاٹ پر پڑھنے والے لڑکوں نے آگے چل کر ایٹم بم بنا دیے۔ مگر اس مختصر سے سنہری دور کے بعد ۱۹۵۸ء میں وہ پہلی لہر اُٹھی جس کی ہر کروٹ بعد ازاں قومی خلفشار کی نصف صدی میں ڈھلتی گئی اس لہر کی وجہ سے پہلے تو سنہری دور کے اچھے انتظامی ڈھانچے کے بخیے ادھڑنے لگے۔ پھر بری گورننس (Governance) کی نت نئی ایجادیں آنے لگیں جن سے آئین و قوانین ٹوٹے۔ پرانی اقدار ٹوٹیں، عوامی خواب ٹوٹے، قومی اُمنگیں ٹوٹیں اور ملک ٹوٹا۔ غرض سب کچھ ٹوٹتا رہا۔ صرف دو چیزیں نہیں ٹوٹیں۔ ایک تو اتحادِ ثلاثہ نہیں ٹوٹا اور دوسرے بڑھتے ہوئے قومی خلفشار کی شدت نہیں ٹوٹی۔ ان دونوں نے وطن کو جو کچھ دیا اس کے اظہار کے لیے صرف ایک ہی لفظ ہے یعنی ''موت'' جو کسی نہ کسی شکل میں نصف صدی سے اپنے پر ہر طرف پھیلا رہی ہے۔ مثلاً اقتدار کے ایوانوں میں آئین اور دستور کی موت۔ عوام کے گرد و پیش امن اور قانون کی موت۔ دھماکوں سے شہر کے سکون کی موت، سیاست میں اخلاقیات اور اصولوں کی موت، ریاستی اداروں میں ضابطوں اور کارروائی کی موت اور دنیا بھر میں پاکستانی سبز پرچم اور سبز پاسپورٹ کے وقار کی موت۔

یہ صورتِ حال بلاشبہ ایک قومی المیہ ہے۔ مگر عظیم تر المیہ یہ ہے کہ ہمارے ادب میں اس کی متناسب عکاسی اس طرح نہیں ہوئی۔ جس طرح ہونا چاہیے

تھی۔ ہمارے ادیب کا قلم قوم کے نڈھال چہرے پر بہنے والے آنسوؤں کا شمار تو کرتا رہا ہے۔ مگر ان آنسوؤں کو پیدا کرنے والی پس پردہ قوتوں کی شناخت، افشاء، تشہیر اور مذمت میں یہ قلم کبڑا، الفاظ لنگڑے اور زبان گنگ ہو جاتی رہی۔ اسی لیے ڈاکٹر طاہر تونسوی نے کہا:

یہ دور اہلِ قلم پہ بھاری کہ مصلحت کی سبیل جاری
گناہ کو بھی ثواب کہنا، ببول کو بھی گلاب کہنا

چنانچہ گزشتہ سانحوں پر مرثیے لکھنے کی خانہ پری تو ہوتی رہی۔ مگر پیش بندی کی کوئی تحریک چلا کر آئندہ سانحوں کا راستہ روکنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی۔ حیف یہ ہے کہ خیر وشر کی موجودہ جنگ میں حصہ لینے کے لیے ہمارا ادیب ادب بھی کمر بستہ نہیں ہے اور سیاست کا ذکر ہوتے ہی وہ ادب کا گھونگھٹ اوڑھ لیتا ہے کہ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ ماضی میں رائٹرز گلڈ اور حال میں دیگر سرکاری ادبی اداروں کی مراعات کی گود میں پلنے والا ادیب سیاست کے نام پر بہو بیٹیوں کی طرح شرم سے لال تو ہو سکتا ہے مگر قوم وملک کو تباہ کرنے والی قوتوں کی کارکردگی پر نہ تو شرمندہ ہوتا ہے نہ غصہ کھاتا ہے اور نہ ہی کلمہ حق کہنے والا جہاد کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ چالیس برس پہلے ۱۹۷۱ء میں ملک کے دو ٹکڑے ہوئے۔ چھبیس برس تک حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ زندہ درگور رہی۔ پھر بیسویں صدی کے آخری دن لنگڑے انداز میں برآمد ہوئے بھی اب تیرہ برس گزر چکے ہیں(۹) مگر اس دوران کتنے ادبی قلم امام حکومتوں کی اس قومی بد دیانتی کے متعلق حرکت میں آئے؟ بے حسی کا یہ رویہ ادب کی صریحاً بے ادبی کرتا ہے۔ کیونکہ ادب کی تقدیس ہی یہی ہے کہ وہ عصری زندگی کی عکاسی کرے۔

آخر میں اس ساری بحث کو مناسب انداز میں سمیٹنے کے لیے میں صرف چند مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان ادیبوں کی جنہوں نے ادیب کا فرض پورا کیا۔ ادب کا حق ادا کیا اور عصری زندگی کی عکاسی کی۔

پہلی مثال انگلستان کی Fabian Society کی ہے جو ۱۸۸۴ء میں چند اہل قلم نے معاشرے کو بتدریج بہتر کرنے کے لیے بنائی۔ آزادئ اظہار کے تحت سوسائٹی کے ہر ممبر کو اپنی بے لاگ تحریر پیش کرنے کا حق تھا۔ مگر نتائج بھگتنے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی اور سوسائٹی ذمہ دار نہ تھی۔ اس طرح مذہب اور سیاست سمیت زندگی کے ہر شعبے پر مضامین پڑھے جانے لگے اور اندرونی بحث کے بعد قومی سطح پر شائع کیے جاتے تھے۔ اپنے اپنے وقت پر جارج برنارڈ شا، گراہام ویلیس اور ایچ جی ویلز (George Bernard Shaw, Graham Wallace, H.G.Wells) اور کئی دیگر ادیب اپنی آہستہ خرامی سے معاشرے کو بہتر بنانے میں مصروف رہے۔ حتیٰ کہ جب انگلستان میں لیبر پارٹی (Labour Party) کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا آئین Fabian Society نے بنایا اور دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد 1945ء میں برٹش پارلیمنٹ کے 229 ممبران Fabian Society کے بھی ممبر تھے۔ آج اگر انگلستان ایک فلاحی ریاست ہے تو اس میں اس سوسائٹی کی سوچ اور عمل کا بہت دخل ہے۔

دوسری مثال الجیریا کے البرٹ کامیو (Albert Camus) کی ہے جس نے دوسری جنگ عظیم میں مفتوحہ علاقوں میں ہر چہار منڈلانے والی موت کو اپنے علامتی ناول The Plague میں ریکارڈ کیا اور خود عملی طور پر فرانس میں جا کر نازی جرمنی کے قبضے کے خلاف مدافعتی تحریک The Resistence میں سرگرم رہا۔

تیسری مثال ژاں پال سارتر (Jean Pau Sartre) کی ہے جس نے اہل قلم کا گروپ تیار کیا۔ البرٹ کامیو کے ساتھ مل کر خفیہ اخبار جاری کیا اور The Resistence تحریک میں بہت سرگرم رہا۔ جنگ کے بعد فرانس کی سرکاری پالیسی کے برعکس مارکسیت کا اتنا کھلا نقیب بنا کہ 1964 میں نوبل پرائز لینے سے انکار کر دیا۔ مگر بعد میں روس کی پالیسیوں اور ہنگری پر قبضے کے بعد اس نے مارکسیت چھوڑنے کا اعلان کیا اور الجیریا کی جنگ آزادی کے زمانے میں اپنے ہی ملک فرانس کے خلاف آواز اُٹھاتا رہا۔

آخری مثال میلان کنڈیرا (Milan Kundera) کی ہے جس کے وطن چیکوسلواکیہ پر روس کے قبضے کے بعد اس کی ساری کتابیں ضبط کر لی گئیں۔ جلاوطنی کے دنوں میں لکھے ناول کے انگریزی ترجمے (Life is Elsewhere) کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے ”میں نے وہ خون آشام دورِ حکومت بڑے قریب سے اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب شاعر اور جلاد دوستانہ انداز میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہوتے تھے۔ ایک جلاد جب سر کاٹتا ہے تو اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ کیونکہ سر کاٹنا اس کا پیشہ ہے مگر جب اس کے مہلک وار کی سنگت میں ایک شاعر دستِ قاتل کا قصیدہ گاتا ہے تو وہ ساری اقدار دھڑام سے نیچے آن گرتی ہیں جنہیں ہم مقدس سمجھتے ہیں۔“

صدر گرامی! اس طویل تمہید کے بعد مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ہمارے خلفشار زدہ معاشرے میں ادیبوں کے احتجاج کی آوازیں کم کم ہیں۔ مگر ان کے طرزِ عمل سے اُٹھنے والی دھڑام دھڑام کی آوازیں بہت زیادہ ہیں۔

(روزنامہ ایکسپریس کے زیر اہتمام اردو کانفرنس میں اس تحریر کا بیشتر حصہ پڑھا گیا۔ لاہور مورخہ ۱۲ اور ۱۳/ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی: چند یادیں چند باتیں

ڈاکٹر افتخار شفیع

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نہ رہے، رہے نام اللہ کا۔

معروف ماہر اقبالیات ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں شعبہ اردو کے سربراہ رہے لیکن ان کا یہ تعارف کافی نہیں۔ ان کی علمی و ادبی کاوشوں سے میری شناسائی تو ایک مدت سے تھی لیکن باقاعدہ تعلق بہت بعد میں قائم ہوا۔ یہ آج سے کوئی پندرہ بیس برس اُدھر کا واقعہ ہے، مجھے امریکہ سے پنجاب یونیورسٹی کے ایک سابق کتاب دار عبدالوہاب خان سلیم صاحب کا فون آیا۔ وہ ایک رسالے میں شائع ہونے والے میرے مضمون کے بارے میں کچھ استفسار کرنا چاہتے تھے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا ''آپ تک میرا یہ مضمون کیسے پہنچا؟''۔ انھوں نے بتایا ''مجھے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے اس کی عکسی نقل پوسٹ کی تھی۔ حج کے سفرناموں میں ہمارے لیے دلچسپی کا خاصا مواد موجود ہے''۔ ان دنوں بہت کم لوگ سوشل میڈیا کے ذریعے رابطہ کرتے تھے۔ علم وادب کے دیوانے زیادہ تر خط لکھا کرتے ہیں۔ نامانوس ٹکٹوں والے لفافوں میں کاغذ اور قلم کے ذریعے دل کی باتیں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس کے بعد ان دونوں بزرگوں عبدالوہاب خان سلیم اور رفیع الدین ہاشمی (اب دونوں مرحومین) سے میرے تعلق کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ایسے قیمتی لوگ اب آہستہ آہستہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں، ہاں کتابوں میں ان کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ بلاشبہ ایسی شخصیات سے تعلق پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ مختار صدیقی کا شعر ہے:

نکتہ وروں نے ہم کو سجھایا خاص رہو اور عام بنو
بستی بستی صحبت رکھو دنیا میں گم نام رہو

ہاشمی صاحب زبان وادب کے عظیم اساتذہ کی اس روایت سے تعلق رکھتے تھے جس میں مولوی محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی اور پروفیسر وقار عظیم جیسے لوگ شامل ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کی تفصیل بیان کرنے کا محل نہیں۔ اس مختصر سے کالم میں تو بس ایک ہلکی سی چھب ہی دکھائی جا سکتی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے میری چند ملاقاتیں ہیں۔ ان کے معمولاتِ زندگی دیکھ کر ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ استاذی پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر نے ایک ملاقات میں بتایا کہ جن دنوں وہ مری کے مرحوم گورنمنٹ کالج (اب کوہسار یونیورسٹی) میں تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے۔ ہاشمی مرحوم چند روز کے لیے ان کے ہاں مقیم رہے۔ انھوں نے مشاہدہ کیا کہ ہاشمی صاحب صبح سویرے اٹھتے، نماز پڑھتے اور سیر کو نکل جاتے تھے۔ ان کے پاس جیبی سائز کا قرآن پاک کا ایک نسخہ تھا، وہ سیر بھی کرتے جاتے اور منزل بھی پڑھتے جاتے تھے۔ بہت سے معاملات میں وہ اصول وضوابط کے پابند تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بہت مصروف زندگی گزاری، درس وتدریس کے علاوہ برصغیر کے مختلف شہروں سے وفود ان سے ملنے کے لیے آتے۔ عائلی زندگی معاملات بھی خوش اسلوبی سے انجام پاتے۔ اپنی انسٹھ سالہ زندگی میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں، شاہ صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اتنی مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف کا بہت سا کام کیسے کر لیا؟۔ انھوں نے فرمایا کہ ''عزیز مکرم! میں وقت کی لمبائی کے ساتھ ساتھ اس کی گہرائی کو بھی استعمال میں لاتا ہوں''۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مرحوم سفر وحضر میں اپنے معمولات کو ایک خاص ترتیب سے انجام دیتے تھے، ان کے ہر عمل میں ایک توازن دکھائی دیتا تھا۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، یہاں محض ان کے اقبال شناسی کے سرمائے کا تذکرہ کرنا مقصود ہے۔ اس دھان پان سے آدمی نے اس موضوع پر اتنی کتابیں لکھیں، کہ بقول شخصے اگر'' ان کتابوں کا وزن کیا جائے تو ہاشمی صاحب کے اپنے وزن سے کچھ زیادہ ہی ہو گا''۔ ہمارے دوست ذوالکفل بخاری مرحوم اہل علم کی زیارت کے شائق تھے، ایک دفعہ سید ابوالحسن علی ندوی کی زیارت کے لیے بطور خاص کراچی کا سفر کیا۔ ہاشمی صاحب کا معاملہ اس سے متضاد تھا۔ وہ جب بھی میرے شہر سے گزرتے، فون کر کے اطلاع دیتے، مختصر قیام میں زیارت کا موقع مل جاتا، واپسی پر بھی ان کا یہی معمول ہوتا تھا۔ جب بھی کسی کانفرنس میں ملاقات ہوتی تو اپنے دولت کدے پر تشریف لانے کا حکم دیتے، ملاقات میں تاخیر ہونے کا شکوہ بھی کرتے۔ ہم نے اپنے کالج کے شعبہ اردو کے زیر تحت ''اقبال اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' کے عنوان سے ایک کانفرنس کروائی، مہمان کے طور پر بطور خاص انھیں مدعو کیا۔ کانفرنس کے بعد وارڈن ہاوس میں ٹھہرانا تھا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ وہی گھر ہے جہاں علامہ اصغر علی روحی کے صاحب زادے اور عربی زبان وادب کے استاد ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق بھی مقیم رہے۔ اسی وقت ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کو فون ملایا اور بڑے فخر سے بتایا کہ ''اس وقت ہم آپ کے مہربان استاد کی روح کی خوشبو کو محسوس کر رہے ہیں''۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر خورشید رضوی کو اپنے ان استاد سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو مختلف غیر ممالک میں جانے کا موقع بھی ملا۔ انھوں نے اپنے ان اسفار کی ڈائری بھی لکھی ہے۔ ان کے سفرناموں میں ایک ایسے انسان سے ملاقات ہوتی ہے جو اصل معنوں میں ''سیروا فی الارض'' کے ارشاد عالیہ کے تابع ہے۔ ایک جگہ انھوں نے اندلس (اسپین) کے سفرنامے میں ضمیمے کے طور پر

فرانس کے ایک یادگار سفر کی روداد بھی شامل کی ہے۔ان دنوں یورپ شدید سردی کی لپیٹ میں تھا۔ ڈاکٹر رحمت اللہ کی رہنمائی میں ہاشمی صاحب نے پیرس کے گلی کوچوں میں شانزالیزے اور فتح محراب، آئفل ٹاور، نپولین کا مقبرہ اور فوجی عجائب گھر وغیرہ کا کی سیر کا خوب تذکرہ کیا ہے۔اس کے باوجود فرانس میں ان کا خاص مقصد عالمی شہرے یافتہ مبلغ اسلام ڈاکٹر حمید اللہ (مرحوم) سے ملاقات کرنا تھا۔انھوں نے اس تفصیلی ملاقات کو باقاعدہ مکالماتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اخوان المسلمین کے امیر سید حسن البناء ؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے کتابیں تصنیف نہیں کیں؟۔انھوں نے جواب میں کہا، ''انا اصنف الرجال (میں انسان تصنیف کرتا ہوں)''۔ہاشمی صاحب نے کتابوں کے ساتھ ساتھ انسان بھی تصنیف کیے۔ان کی یہ کتابیں شاگردوں کی صورت میں موجود ہیں۔

ان نیک نام شاگردوں میں ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر ظفر حسین ظفر، ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، ڈاکٹر وحید الرحمان خان، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر خالد ندیم ڈاکٹر صابر کلوروی، ڈاکٹر عطش درانی، ڈاکٹر جاوید اصغر، ڈاکٹر ایوب منیر، ڈاکٹر محمد کامران اور بہت سے دوسرے لوگ شامل ہیں۔مجھے یقین ہے کہ ہاشمی صاحب کے دوست عبدالوہاب خان سلیم زندہ ہوتے تو ان کا وفات پر قطعہ تاریخ ضرور لکھتے۔میں مبتدی ہوں لیکن ان کے حوالے سے اپنی ایک نظم کے دو شعر قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

اے عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں
اے ضیائے کعبہ ء روحانیاں
پیر تو اقبال گفت اے ارجمند!
''پاک مرداں از مقاماتِ بلند''

بشکریہ روزنامہ ''نوائے وقت''
سولہ فروری دو ہزار چوبیس

غزلیات

علی رضا/ساہیوال

ہم نے دنیا نہ خیالِ غمِ دنیا رکھا
دھوپ میں جلتے رہے، سر پہ نہ سایہ رکھا
اُس سے میں کیسے محبت کی توقع رکھوں
جس نے اک عمر مجھے دشت میں پیاسا رکھا
مجھ کو قسمت نے رکھا جیسا بھی اس دنیا میں
تو بتا! تجھ کو ترے بخت نے کیسا رکھا؟
یوں بھی قسمت کا لکھا کیسے بدل سکتا ہے
جس نے جس حال میں رکھا، ہمیں اچھا رکھا
کسی حالت میں بھی اِس دل کی تشفی نہ ہوئی
ہم کو احباب کی محفل نے بھی تنہا رکھا
ہم کہاں تھے بھلا ناز اُس کے اُٹھانے والے
جس نے اک عمر سرِ وعدہ؟ فردہ رکھا در بدر ہو
گئے ہم جس سے نکلتے ہی رضا
ہم نے اُس شہر سے بھی درد کا رشتہ رکھا

ملا نہ شہر میں تیرے اگر سہارا کہیں
نکل ہی جاؤں گا میں بھی تھکن کا مارا کہیں
بچھڑ گیا ہے جو ہلکی سی چھب دکھا کے مجھے
یقین دل کو ہے مل جائے گا دوبارہ کہیں
کچھ اس لیے بھی میں رُخ اُس طرف نہیں کرتا
ٹھہر نہ جائے نگاہوں میں وہ نظارہ کہیں
سجھائی دیتا نہیں کچھ بھی مجھ کو دنیا میں
خیال ذہن سے ہٹ جائے گا تمہارا کہیں
وہ جس مقام کو چھوڑا ہزار کوشش سے
وہیں کو لے نہ چلے زندگی دوبارہ کہیں
یہ خوش گمانی لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
کوئی تو ہوگا رضا منتظر ہمارا کہیں

لبوں کو سیتے ہیں، اپنے انا کو مارتے ہیں
چلو اِسی طرح ہم زندگی گزارتے ہیں
جہاں قدم بھی نہیں ہم نے آج تک رکھا
وہ راستے بھی ہمیں جانے کیوں پکارتے ہیں
تمہارے شہر کو نکلے ہیں چھوڑ کر جب سے
عجب عذاب، عجب کرب میں گزارتے ہیں
تمام عمر اِسی پیرہن میں گزری ہے
یہ غم لبادۂ جاں ہے، اِسے اُتارتے ہیں
قمار خانۂ دنیا کی پوچھتے کیا ہو
جو اِس بساط پہ اُتریں وہ جان ہارتے ہیں
لبوں پہ نام بھی اب اُس کا لا نہیں سکتے
اگرچہ دل میں اُسے رات دن پکارتے ہیں
جمالِ یار! کرم ہے ترا کہ ہم جیسے
ترے حوالے سے رنگِ سخن نکھارتے ہیں
یہ عام لوگ نہیں سرسری نہ دیکھ انھیں
جو لوحِ دل پہ ترے خال و خد اُتارتے ہیں
علی رضا کوئی دن گھر میں چین سے بیٹھو
سفر کے بعد پرندے بھی پَر سنوارتے ہیں

زندہ رہنے کا ایک بہانہ سہی
رابطہ تجھ سے غائبانہ سہی
میری خواہش نہیں ہے قصرِ بلند
کوئی چھوٹا سا آشیانہ سہی
نہ سہی رسم و راہ دنیا سے
آپ کا مجھ کو آستانہ سہی
تیری قُربت چلو نصیب نہیں
میرے لب پر ترا فسانہ سہی
کٹ ہی جائیں گے دن ہمارے بھی
تیرے ہمراہ اک زمانہ سہی
صحنِ گلشن نہیں رہا تو رضا
اب قفس کا ہی آب و دانہ سہی

ڈاکٹر احمد ندیم رفیع / امریکا

کبھی کُھلا ہی نہیں بابِ گفتگو ورنہ
جواب ہی نہیں دیتے، سوال بھی کرتے

ڈاکٹر احمد ندیم رفیع گزشتہ تین دہائیوں سے شعروادب سے وابستہ ہیں۔2000ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''آنکھوں میں ستارے رہنے دے'' منظرِ عام پر آیا۔ جسے ادبی اور عوامی حلقوں میں سراہا گیا۔ پھر وہ بسلسلہ اعلیٰ تعلیم آئرلینڈ چلے گئے۔ آج کل امریکا میں Spine & Pain سپیشلسٹ کے طور پر اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ بیرونِ ملک قیام کے دوران بھی انہوں نے شاعری سے اپنا رشتہ استوار رکھا۔ ان کی غزلوں کے معیار سے ان کی ریاضت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی شاعری قدیم وجدید کے امتزاج سے مزیّن ہے۔ ان کی غزل کے مضامین ذات سے کائنات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سادگی، شگفتگی اور بے ساختگی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ (حسن عباسی)

سوالِ رزق نہ ہوتا تو عاشقی کرتے
خیالِ یار سے مل کر سخن وری کرتے

تمام عمر گزاری نفس شماری میں
تمہارا ساتھ جو ہوتا تو زندگی کرتے

تو میرے قصۂ غم کا تھا مرکزی کردار
سو تیرا ذکر بھلا کیسے سرسری کرتے

خدا نہیں تھا مگر تو خدا کے جیسا تھا
جو اختیار میں ہوتا تو بندگی کرتے

جہاں کہیں تھے بجھاتے رہے شکم کی آگ
تمہارے پہلو میں ہوتے تو شاعری کرتے

کوئی فراق میں بے نام جی رہے ہیں اب
کہ حوصلہ ہی کہاں تھا جو خودکشی کرتے

کبھی کُھلا ہی نہیں بابِ گفتگو ورنہ
جواب ہی نہیں دیتے، سوال بھی کرتے

رموزِ عشق میں اتنے بھی ناشناس نہیں
کہ حُسنِ یار کی غیروں میں مخبری کرتے

تمہاری بات میں پنہاں تھے میرے اندیشے
وگرنہ کیسے یہ ممکن تھا ان سنی کرتے

مدت سے پس کنارِ مژگاں
بے تاب کھڑے ہیں اشک غلطاں

دیوارِ ہنر کے پار کب سے
ویران پڑا ہے دشتِ حیراں

کھنچے ہوئے ہیں دبیز پردے
پھر بھی ہیں مرے نقوش عریاں

تنہائی ہے محوِ خواب لیکن
بیدار ہے محفلِ نگاراں

تشنہ لبی کے کٹھن سفر میں
دمساز رہی ہے چشمِ گریاں

الفاظ ہوئے ہیں جب سے رُخصت
ہے بزم گہِ خیال ویراں

اُلجھی ہوئی ہیں ہزار سوچیں
جب سے کُھلی ایک زُلفِ پیچاں

میرا چلن انتظارِ پیہم
تیرے اطوار عہد و پیماں

مصروفِ دُعائے نیم شب تو
میں بھی سرِ شام سبحہ گرداں

صوت و آہنگِ صبحِ خنداں کا
ساز تھا رازہائے پنہاں کا

جس کو منزل سمجھ رہا تھا میں
موڑ تھا کاکلِ پریشاں کا

شبِ ہجراں میں آشکار ہوا
تو ستارہ تھا کنجِ مژگاں کا

جس سے ٹکرائی موجِ فکر مری
وہ کنارہ تھا بحرِ امکاں کا

گھیر لیتے ہیں ان گنت چہرے
جب اُٹھاتا ہوں پردہ نسیاں کا

بات ہونٹوں پہ آ کے ختم ہوئی
جب ہوا ذکر لعل و مرجاں کا

چشمِ صبحِ نشاط پر اب بھی
قرض باقی ہے شامِ گریاں کا

تیری چپ نے یہ راز فاش کیا
تو لبادہ تھا حرفِ عریاں کا

جس کو دنیا سمجھ رہی تھی حجاب
ایک دھوکا تھا چشمِ حیراں کا

ابھی ظاہر ہے اور ابھی پنہاں
رگِ فطرت ہے رم غزالاں کا

مجھ کو لوٹا گیا تھا جس کے لیے
محض اک تار تھا گریباں کا

حیرتِ شوقِ تماشا، رُخِ زیبا تیرا
دیکھ انگشت بہ دنداں ہے یہ شیدا تیرا

ہمہ تن گوش ہے خود عالمِ بالا کا سکوت
غیرتِ حُسنِ سماعت، لبِ گویا تیرا

شبِ دیجور تری زُلفِ سیہ کی تلچھٹ
مطلعِ صبح کو شرمائے اُجالا تیرا

نیلگوں جھیل ترے جادۂ منزل کا سراغ
عکسِ مہتاب فقط نقشِ کفِ پا تیرا

تجھ کو دیکھوں کہ ترے عکس نما کو دیکھوں
پسِ آئینہ مجسم ہے سراپا تیرا
محفلِ ساغر و مینا سے میں اُٹھتا کیسے؟
قلقلِ مے سے ہم آہنگ تھا ہنسنا تیرا
وسعتِ چشمِ غزالاں کی قسم دیکھ اِدھر
میری آنکھوں میں ہے سمٹا ہوا صحرا تیرا

اے دل! نوائے بیم و رجا، سن نہ لے کوئی
یہ داستانِ ہوش رُبا، سن نہ لے کوئی
وہ خوش جمال مرکزِ ہر چشم و گوش ہے
پائے نگہ! سنبھل کے ذرا، سن نہ لے کوئی
تزئینِ زُلفِ یار ہیں گل ہائے خندہ زن
آہستہ زُلفِ یار ہٹا، سن نہ لے کوئی
بادِ صبا ہے ڈھونڈھے چمن در چمن اسے
چپکے سے حالِ زار سنا، سن نہ لے کوئی
ٹوٹا پڑا ہے شیشۂ دل مے کدے کے بیچ
ساقی سنبھل کے پاؤں اُٹھا، سن نہ لے کوئی
بے شک خدا سے مانگ پر آہستگی سے مانگ
رازو نیازِ حرفِ دعا، سن نہ لے کوئی
دم سادھے بزمِ یار میں بیٹھے رہو ندیم
موجِ نفس میں دل کی صدا، سن نہ لے کوئی

کوئی آتا کوئی جاتا دیکھا
عمر بھر ایک تماشا دیکھا
سفرِ شوق کی روداد نہ پوچھ
کبھی صحرا، کبھی دریا دیکھا
ایک فرزانہ سرِ راہِ وفا
کبھی روتا، کبھی ہنستا دیکھا
زندگی خاک میں رُلتی دیکھی
آسماں رنگ بدلتا دیکھا

باصفا حُسن پہ کیا کیا گزری
باوفا عشق نے کیا کیا دیکھا
ساقیا! تیرے کرم کے باوصف
ہر طلب گار کو پیاسا دیکھا
جانے کس حال میں دیکھا تجھ کو
پھر کوئی اور نہ تجھ سا دیکھا
لبِ خنداں پہ کلی کا جوبن
چشمِ حیراں میں ستارہ دیکھا
ایک چلمن کہ ذرا سی سرکی
ایک چہرہ کہ ذرا سا دیکھا
جھیل میں عکس پڑا جب تیرا
چاند نے اپنا سراپا دیکھا
کھل گیا دفترِ اشعار ندیمؔ
جب کوئی حرف شناسا دیکھا

کیسے ممکن تھی مرے دل سے رہائی تیری
میں نے دنیا سے حقیقت تھی چھپائی تیری
تیری آمد پہ بصد چشمِ تصور میں نے
ہر گلی کوچے میں تصویر لگائی تیری
جیسے پیمانہ چھلکتا ہوا رنگ و بو کا
رشکِ اندازِ چمن جلوہ نمائی تیری
گُلِ نو رستہ سے ماخوذ سراپا تیرا
حیرتِ موجِ صبا غالیہ سائی تیری
دیر تک حُسنِ ساعت کے دریچے کھولے
پھول برساتی رہی شوخ نوائی تیری
یوں تو آنچل میں چھپا تھا ترا چہرہ لیکن
مخبری کرتا رہا دستِ حنائی تیری
ساعتِ وصل ترے جسم کی حدت ہی نہیں
میرے انفاس نے خوشبو بھی چرائی تیری

میں نے ہر غم کو ترے غم میں چھپا کر رکھا
کثرتِ غم کو میسّر تھی اکائی تیری
ہٹ گیا پیچھے شبِ ہجر کا بڑھتا آسیب
جب اسے کاکلِ شب تار دکھائی تیری
مہِ کامل نے پنہ لے لی گہن کے پیچھے
دستِ قدرت نے جہاں زُلف ہٹائی تیری

اگرچہ دشتِ جنوں سے میں بارہا نکلا
اُڑا کے خاک جہاں کی وہیں پہ جا نکلا
سناتے کس کو تری کج ادائی کا قصہ
ہر ایک شخص ترا ہجر آشنا نکلا
ہنوز رقص کناں ہے میانِ ہست و بود
شبِ وصال کا ہر پل گریز پا نکلا
قدم قدم پہ تھے لرزاں سراب معنوں کے
میانِ حرف و بیاں بعدِ ناروا نکلا
مری جلو میں رہی اک حسین پرچھائیں
تمہارا ساتھ رہا میں جہاں بھی جا نکلا
جو تیرے وعدے کی زنجیر سے بندھا ہوا تھا
وہ انتظار بہت صبر آزما نکلا
عجب کہانی تھی تیری مری محبت کی
کہ مخمصہ ہی رہا کون بے وفا نکلا
بھٹک رہے تھے غلط فہمیوں کی غار میں ہم
چٹانِ شک کی ہٹائی تو راستہ نکلا
برا جمان ہوا جب تو میرے پہلو میں
ہمارے بیچ میں صدیوں کا فاصلہ نکلا

کیوں نہ ٹھہریں، ہدفِ ناوک بیداد کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے
(غالبؔ)

اقبال نوید/برطانیہ

میرے خیال میں اقبال نوید کی شاعری دو مختلف لہروں، دو مختلف رنگوں کی شاعری ہے۔ایک ذات کے اندر کی لہر دوسری وہ خارجی لہر ہے جو احساس کی سطح پر ہلچل مچاتی ہے اور اندر کہیں مدوجزر پیدا کرتی ہے۔اقبال نوید اپنے عصر کے سماجی وسیاسی دکھ کو صرف محسوس ہی نہیں کرتے بلکہ اس درد کا مسلسل حصہ بنے رہنے والے سنجیدہ تخلیق کار ہیں۔زبردستی کی عشق بازی، غم جاناں اور خوامخواہ کے ہجر ووصال سے ان کے مضامین کوسوں دور ہیں۔نہ نغمہ نے، نہ سرورمے، محبت کی بات بھی کی تو ایسے نہیں کہ دور سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا ہو۔اقبال نوید کا کمال یہ ہے کہ تجربہ ان کی تخلیق میں ایک وجود بن کر اُبھرتا ہے۔ان کا احساس تخلیق میں شوریدگی کی بجائے ایک ٹھہراؤ اور پختگی پیدا کرتا ہے۔(ڈاکٹر ثاقب ندیم)

اُکھڑتی سانس پہ زندوں نے آ لیا مجھ کو
کہ وقتِ مرگ درندوں نے آ لیا مجھ کو
بدن پہ خون کی تحریر کیا نظر آئی
فضا میں اُڑتے پرندوں نے آ لیا مجھ کو
بچھڑتے وقت محبت کا بوجھ سر پر تھا
چلا تو قرض دہندوں نے آ لیا مجھ کو
میں لڑکھڑایا تو سمجھے بہک رہے ہیں قدم
تمام شہر کے رِندوں نے آ لیا مجھ کو
سخن شناس زمانے کی سلطنت میں نوید
ادب کے شکوہ کنندوں نے آ لیا مجھ کو

یہ شک کا سانپ ہے اوروں کے بل میں جائے گا
کہ آستین سے نکلا تو دل میں جائے گا
دکھوں کی بخیہ گری تو رہے گی آنکھوں تک
جو دل کا زخم ہے چہرے کے تِل میں جائے گا
محبتوں کے خزانے کی جستجو سے کُھلا
کہ اس کا نقشہ دلِ سنگ دل میں جائے گا
گزر رہا ہوں میں محنت کشوں کی بستی سے
مجھے یقین ہے رستہ یہ مِل میں جائے گا
یہ ہجر آ تو گیا ہے وبا کے ساتھ نوید
شدید رُت میں نہیں معتدل میں جائے گا

اگرچہ پار کاغذ کی کبھی کشتی نہیں جاتی
مگر اپنی یہ مجبوری کہ خوش فہمی نہیں جاتی

خداجانے گریباں کس کے ہیں اور ہاتھ کس کے ہیں
اندھیرے میں کسی کی شکل پہچانی نہیں جاتی
مری خواہش ہے دنیا کو بھی اپنے ساتھ لے آؤں
بلندی کی طرف لیکن کبھی پستی نہیں جاتی
خیالوں میں ہمیشہ اُس غزل کو گنگناتا ہوں
کہ جو کاغذ کے چہرے پر کبھی لکھی نہیں جاتی
وہی رستے، وہی رونق، وہی ہیں عام سے چہرے
نوید آنکھوں کی لیکن پھر بھی حیرانی نہیں جاتی

ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ تنہا نہیں ملتا
ملتا ہے مگر ایسے کہ گویا نہیں ملتا
حاصل ہے وہی جس کی نہیں آرزو کوئی
آنکھوں کو کبھی خواب تمنا نہیں ملتا
اس طرح کیے ہیں تری تصویر کے ٹکڑے
اب ڈھونڈ رہا ہوں ترا چہرہ نہیں ملتا
کس بات پہ میں روٹھ کے دنیا کو دکھاؤں
بچہ بھی نہیں جس کو کھلونا نہیں ملتا
آواز سنائی مجھے دیتی ہے اُدھر سے
بینائی کو دیوار سے رستہ نہیں ملتا

یہ زمیں ہم کو ملی بہتے ہوئے پانی کے ساتھ
اک سمندر پار کرنا ہے اسی کشتی کے ساتھ
عمر یونہی تو نہیں کٹتی بگولوں کی طرح
خاک اُڑنے کے لیے مجبور ہے آندھی کے ساتھ

جانے کس اُمید پر ہوں آبیاری میں مگن
ایک پتہ بھی نہیں سوکھی ہوئی ٹہنی کے ساتھ
میں ابھی تک رزق چننے میں یہاں مصروف ہوں
لوٹ جاتے ہیں پرندے شام کی سرخی کے ساتھ
پھینک دے باہر کی جانب اپنے اندر کی گھٹن
اپنی آنکھوں کو لگا دے گھر کی ہر کھڑکی کے ساتھ
جان جا سکتی ہے خوشبو کے تعاقب میں نوید
سانپ بھی ہوتا ہے اکثر رات کی رانی کے ساتھ

گمان کیا ہے یقین کیا ہے خبر نہیں ہے
یہاں کے لوگوں کا دین کیا ہے خبر نہیں ہے
یہ کائناتوں کی زندگی کا سفر ہے کیسا
یہ آسماں اور زمین کیا ہے خبر نہیں ہے
خلا سے آگے نکل کے گتھی سلجھ سکے گی
مکان کیا ہے مکین کیا ہے خبر نہیں ہے
عجیب صورت ہے جو بھی آتا ہے ڈوبتا ہے
کہ سطح سے تہ نشین کیا ہے خبر نہیں ہے
نظر اُٹھاؤں تو ایک سے بڑھ کے ایک تر ہے
کہ دلربا دلنشین کیا ہے خبر نہیں ہے
نوید دن رات جس ڈرامے میں جی رہے ہیں
اب آخری اس کا سین کیا ہے خبر نہیں ہے

لو، ہم ایک سال اور پرانے ہو گئے

امجد محمود چشتی/ میاں چنوں

عمر رفتہ کی مانند سن تئیس بھی قصہ پارینہ ہوا اور ہم ایک سال مزید پرانے ہو گئے۔ سال مہینوں میں، مہینے ہفتوں میں، ہفتے دنوں میں اور دن گھنٹوں میں ایسے بھاگ رہے ہیں جیسے کوئی پیچھے لگا ہو۔ کوئی صاحب تدبیر ایسا نہیں جو وقت کو روکے۔ صبح وشام کا اس تیزی سے ہونا، زندگی کے تمام ہونے کا پیش خیمہ ہی تو ہے۔ بے کار کی مصروفیت اور خود ساختہ عجیب وغریب لائف سٹائل نے ہم سے وقت گزرنے کا احساس بھی چھین لیا ہے۔ احباب کا خیال ہے کہ اب سال، ایک سال سے زیادہ چلتا نظر نہیں آتا مگر ہمارے مطابق تو اب ایک سال تین ماہ کے برابر ہی چل پاتا ہے۔ بھلے وقتوں میں سال گزرنے کا ایک ایک لمحہ یاد رہتا اور دن گن گن کر عیدوں تہواروں کا انتظار کیا جاتا تھا۔ اب تو کسی تقریب کے آفٹر شاکس باقی ہوتے ہیں کہ پھر سے عود کر آجاتی ہے۔ یوں اب زندگی گزاری نہیں بس بھگتی جا رہی ہے۔ گزرے لمحات خواب خواب سے دِکھتے ہیں۔ بچپن کا جگنو، کاغذ کی کشتی، بارش کا پانی اور وہ خوابوں کھلونوں کی جاگیریں کون بھولے؟۔ جب رشتوں کے بندھن اور دنیا کے غم اجنبی تھے۔ مگر ان گزرے لمحوں، بچھڑے لوگوں اور بچپن کے لَوٹنے کی حسرتِ ناکام لئے انسان خود زمین اوڑھ کر سو جاتا ہے۔ کبھی تو اپنی بے بسی پہ ترس آتا ہے۔ کسی نے دنیا میں آتے پوچھا نہ جاتے اور تقدیر بھی لکھی تو کاتب نے۔ سچ ہے کہ جیسے ریل کو اس کا انجن زور لگا کر پٹڑی پر چھوڑ دیتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی کسی طاقت نے زندگی کی پٹڑی پر دھکیل دیا ہے۔ ہم چلے جا رہے ہیں مگر وقت کے ساتھ ہماری رفتار دھیمی پڑ رہی ہے اور ہم اس ریل کی طرح کسی ایسے مقام (سٹیشن) پر رکنے والے ہیں جو شاید ہمارا دیکھا بھالا نہ ہو۔ وقت بھی عجیب شئے ہے۔ ظالم بھی ہے، منصف بھی اور مرہم بھی۔ اچھا ہو تو نہ ٹھہرے، برا ہو تب بھی گزر جائے۔ ڈوبتے سورج کو دیکھ کر زیست کے بوجھ کا احساس تھکاتا ہے تو کبھی بالوں میں آئی چاندی ڈرا دیتی ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے ناسٹلجیا کا کرب گمبھیر ہوتا جاتا ہے۔ ہر نئی رُت اور خوشی کے موقع پر جانے والے کس شدت سے یاد آتے ہیں اور ہر نیا موسم پرانی یاد لے کر آ جاتا ہے۔ جس قافلے کے ساتھ ہم نے زندگی کا سفر شروع کیا تھا اب اس کے منظر کتنے بدل چکے ہیں۔ بہت سے پیارے اس کارواں میں دکھائی نہیں دیتے۔ بقول شاعر

پھوٹ پڑتا ہے درد کا چشمہ
یاد جب ایڑیاں رگڑتی ہے

یہ ہر انسان کا المیہ ہے تاہم اگلے جنم یا جنت میں پھر سے ملنے کی آس ضرور ہے۔ ہندو سات جنم کی بات کرتے ہیں کہ انسان مرنے کے بعد کسی نہ کسی روپ میں دنیا میں پھر آتا ہے۔ انسان مسلسل سفر میں ہے اور اسے کوئی مقام جچ نہیں پاتا۔ روح سے ماں کے پیٹ میں منتقل ہو کر نو ماہ کی کامل حیات گزارنا اور پھر اس جہان رنگ وبو میں حیات مستعار گزار کر چل دینا۔ یوں ایک دنیا سے دوسری دنیا میں انتقال کا عمل جاری رہتا ہے۔ اک لمحہ سوچئے کہ جب اپنے گھر یا محل سے چار کہار جنازہ اٹھانے آتے ہیں تو جانے والا گھر کے در و دیوار کو کس حسرت سے تکتا ہو گا اور یہی انسان کی بے بسی کی معراج ہے۔ مگر یہی موت کبھی نجات بھی ہے جو نہ ہو تو آدم سے اب تک کتنے لوگ بے یار و مدد گار ملیں۔ میڈیکل سائنس کے موجب بعض ضعیف مصنوعی تنفس کے سہارے عالم نزع کی اضافی تلخیاں برداشت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے کنجِ مزار میں پاؤں پھیلا کر سونے کی بات کی تھی۔ زندگی کے سبھی ادوار charmful ہو سکتے ہیں مگر بڑھاپا صرف harmful ہی ہوتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں کوئی خوشی اور امید باقی نہیں رہتی۔ تب انسانی روح دنیا کی خباثتوں، پریشانیوں اور دکھوں سے تنگ آ جاتی ہے۔ جیسے ایک ننھا بچہ گھر سے باہر اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کا بے حد شوق رکھتا ہے۔ اس کا سارا انہماک کھیل میں ہوتا ہے اس کی ماں بار بار دروازے پہ آ کے جھانکتی ہے، اُسے بُلاتی ہے مگر وہ مگن رہتا ہے آخر چند گھنٹوں بعد وہ تھکنے لگتا ہے اب وہ بار بار گھر کی جانب دیکھنے لگتا ہے اور بھاگ کر گھر آ جاتا ہے جہاں ماں کی آغوش میں سب تھکن بھول جاتا ہے۔ گویا ہماری روح بھی تھک جاتی ہے جو کسی پر امن پناہ کی متلاشی ہوتی ہے۔ ہم سب اس بچے کی طرح اپنے اپنے دھندوں، تماشوں اور کاموں میں مشغول ہیں۔ وقت کا پہیہ اتنی تیزی سے گھومتا ہے۔ زندگیاں بیت جاتی ہیں اور کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی۔ آخر ہم اک روز تھک جاتے ہیں اور ستر ماؤں جیسے اللہ کی محفوظ پناہ میں جا کر ابدی سکون پا لیتے ہیں۔ خدا کرے ہماری زندگی کی شام بن شام نہ گزرے۔ یقین ہے کہ ہر جان نے مر جانا ہے لہٰذا مرنے تک اسے زندہ رہنے کا حق اور موقع ضرور ملنا چاہئے۔

جس پہ احباب بہت روئے فقط اتنا تھا
گھر کو ویران کیا قبر کو آباد کیا

لاہور کے عشق میں مبتلا چند مشاہیر

نیلما ناہید درانی / برطانیہ

مغلیہ دور کی ملکہ نور جہان جو چوتھے مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کی چہیتی ملکہ تھیں انھیں لاہور سے عشق تھا۔۔۔راوی کے کنارے دلکشا باغ انھوں نے بنوایا۔اسی باغ کے درمیان۔۔ شہنشاہ جہانگیر کی وفات کے بعد ان کا مقبرہ اپنی نگرانی میں تعمیر کروایا۔۔۔نور جہان کا بھائی جو جہانگیر کا وزیر اعظم بھی تھا۔۔آصف جاہ کا مقبرہ بھی اس کے قریب بنایا گیا۔۔۔کچھ فاصلے پر ملکہ نور جہان کا مقبرہ بھی ہے جسے شاہ جہان نے تعمیر کروایا۔جبکہ شہزادہ کامران نے دریائے راوی کے اندر بارہ دری تعمیر کروائی۔۔جسے آج بھی کامران کی بارہ دری کہا جاتا ہے

ملکہ نور جہان نے لاہور سے اپنی محبت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے لاہور سے انہیں بہت محبت تھی

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم

جان دادہ ایم وجنتِ دیگر خریدہ ایم

اس شعر کا اردو ترجمہ اس طرح ہے

(لاہور کو ہم نے جان کے برابر قیمت دے کر حاصل کیا ہے

ہم نے جان قربان کر کے نئی جنت خرید لی ہے)

نور جہان کے مقبرے پر سنگ مرمر کی سلیب پر ان کا یہ شعر کندہ ہے

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

اس شعر کا اردو ترجمہ ہے

(ہم غریبوں کے مزار پر نا کوئی چراغ ہے نا پھول ہیں

نا کسی پروانے کا پر جلتا ہے نا ہی کوئی بلبل بولتی ہے)

پاکستان کے شعبہ آثار قدیمہ اور محکمہ سیاحت کی ناقدری کی وجہ سے یہ مقبرہ اسی شعر کی ترجمانی کرتا ہے۔

گورنمنٹ کالج کے استاد اور مزاح نگار پطرس بخاری نے کہا تھا کہ لاہور کے کاٹے کا علاج نہیں

کرشن چندر نے لاہور کے بارے میں لکھا۔یہ شہر آدمی کو بوڑھا نہیں ہونے دیتا،مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کی ابتدائی زندگی لاہور میں گزری۔انھوں نے ایف سی کالج میں تعلیم حاصل کی۔وہ اس شہر سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ برصغیر سے بٹوارے کے بعد انھیں بادل ناخواستہ ہجرت کرنی پڑی۔

جس کے بارے میں انھوں نے ایک ناول لکھا۔۔غدار۔۔۔جس میں وہ ایک کتے کو کہتے ہیں۔۔۔کہ تمہیں ہجرت نہیں کرنی پڑے گی کیونکہ تم انسان نہیں ہو۔۔۔اور تمہارا کوئی مذہب نہیں ہے۔

کرشن چندر ممبئی میں رہ کر اپنی روح لاہور ہی میں چھوڑ گئے۔اس شہر کا تذکرہ وہ کسی بچھڑے ہوئے محبوب کی طرح رقّت آمیز لہجے میں کیا کرتے تھے۔وہ لاہور سے آنے والوں کو بڑی حسرت سے دیکھتے اور اپنے محبوب شہر کی گلی کوچوں ، بازاروں ، عمارتوں ، باغوں کا تفصیل سے حال معلوم کیا کرتے۔افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی جنھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز محسن لاہوری کے قلمی نام سے کیا تھا، مرتے دم تک لاہور کے عشق میں گرفتار رہے۔لاہور کی باتیں کرتے ہوئے اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ایک مرتبہ ٹی وی پر انٹرویو کے دوران لاہور کا ذکر آیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

افسانہ نگار اے حمید نے لاہور کے بارے اپنی یاداشتیں لکھی ہیں۔۔۔وہ امرتسر سے ہجرت کے بعد لاہور کے علاقے سمن آباد میں مقیم رہے۔۔اے حمید کہا کرتے تھے کہ لاہور کا نام زبان پر آتے ہی طلسم و اَسرار کی الف لیلہ کا ایک باب کھل جاتا ہے

لاہور ایک شہر ہی نہیں، بلکہ ایک کیفیت کا نام ہے۔وہ بھارتی اداکار جو لاہور سے ہجرت کر کے گئے تھے ہمیشہ لاہور کو یاد کرتے رہے۔۔۔جمنا داس اختر ، گوپال متل ، پران ، دیو آنند ، کامنی کوشل ، اوم پرکاش

لیش چوپڑا۔۔۔۔اِن جیسے کئی مشاہیر لاہور سے کوچ کر گئے۔لیکن اُن کے دل لاہور میں ہی اٹکے رہے۔۔گویا لاہور ایک کیف و مستی کا نام ہے۔ایک نشہ ہے جو طاری ہو جائے تو اترنے کا نام نہیں لیتا۔

لاہور کے لیے میری ایک پنجابی نظم

اک نظم اپنے شہر لاہور لئی

لہور شہر دی

اک موری

باراں (12) دروازے

تیراں (13) میلے

کنیاں شیواں

کنے ٹھیلے

ڈھول ڈھمکے

ڈوم، مراثی

اچیاں پینگاں

نال پنگھوڑے

تل والے لڈو

نال پھوڑے

موت دا کھوہ تے

روسی سرکس

گھگھو گھوڑے

نان پکوڑے

لمبے قتلمے

کانجی تے گنے

گل دے کینٹھے

کچ دیاں ونگاں

کدھرو یکھاں

کدروں لنگاں

لہور شہر دے تیراں میلے

گھر جاواں میں کیہڑے ویلے

دُنیا کے قدیم ترین تہذیبی و ثقافتی شہر

خاور اعجاز

دُنیا کے ہر شہر کی ایک کہانی ہوتی ہے۔ قدیم شہروں کی ثقافتی ورثوں میں گھری ہُوئی کہانیوں کی ایک دلچسپ تاریخ ہے۔ یہ کہانیاں فنِ تعمیر اور انسانی تہذیبوں کے ارتقا کے نقوش کا اظہار کرتی ہیں۔ دُنیا کے بیشتر قدیم شہر جغرافیائی آفات اور انسانی جبر و استبداد کے مختلف ادوار سے گذرے ہیں؛ تو آیئے دُنیا کے قدیم ترین شہروں، اُن کے تہذیبی پس منظر اور ثقافتی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

سمیر کو عام طور پر بنی نوع انسان کی ابتدائی تہذیب کے طور پر شمار کیا جاتا ہے اور یہ اصطلاح اس خطے کی قدیم ترین بائبلی تہذیب یعنی شنار کی قدیم ترین تہذیب کے ساتھ مربوط ہے۔ شنار، میسوپاٹامیا کا جنوبی علاقہ ہے جو عبرانی بائبل میں مذکور ہے۔ کچھ مورخین شنار/سنار کو سمیر کا مغربی متغیر خیال کرتے ہیں۔ اٹھارویں خاندان کے چھٹے فرعون تھٹموس سوم (Thutmose III:1479-4125BC) کی ایشیائی فتوحات کے تناظر میں شنار کی شناخت سنگارا یا سنگار کے نام سے بھی کی گئی ہے۔ چودھویں صدی قبل مسیح میں اسے سنہر Sanhar یا سنکھر Sankhar بھی کہا گیا ہے تاہم عبرانی بائبل میں سنار کا اشارہ بابل کی طرف جاتا ہے کیونکہ نمرود کی بادشاہی کا آغاز شنار کی سرزمیں میں بابل، ایرک (عروق)، اکاد اور کلاب میں ہُوا اور طوفانِ نوح کے بعد بابل کے مینار کا مقام وہی میدان ہے جسے شنار گھیرے ہُوئے تھا۔ بعد ازاں بادشاہ امرافیل Amraphel شنار پر حکومت کرتا رہا۔ تواریخ میں آتا ہے کہ امرافیل نے دُوسرے بادشاہوں کے ساتھ ایلم کے چیدورلاؤمر Chedorlaomer کی سرکردگی میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں کنعان پر حملہ کیا تھا۔ مذکورہ اتحاد نے بحیرۂ مردار کے مغرب میں واقع وادیِ سدیم Siddim کی لڑائی میں سدوم Sodom اور دُوسرے شہروں کو شکست دی۔

''بائبلوس'' Byblos جس کا عربی نام جبیل ہے ۸۸۰۰ اور ۷۰۰۰ ق م کے درمیان سے آباد سمجھا جاتا ہے تاہم ۵۰۰۰ ق م سے مسلسل آباد شہروں میں سے ایک ہے۔ تیسری صدی قبل مسیح میں یکساں سائز کے بنے ہُوئے مکانات کی باقیات یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ وہ دَور تھا جب کنعانی تہذیب نے ترقی کرنا شروع کی تھی۔ تاریخی لحاظ سے یہ متعدد تہذیبوں کا حصہ رہا جن میں مصری، فونیشی، آشوری، فارسی، رومن، فاطمید، مملوک اور عثمانی شامل ہیں۔ ۷۳۸ تا ۶۲۷ ق م میں بائبلوس آشوری بادشاہت کے زیرِ اثر رہا۔ پھر فارسیوں کے ذریعے قائم کی جانے والی فونیشی جاگیردار سلطنتوں میں سے ایک رہا۔ ۳۳۲ ق م میں اس علاقہ میں سکندرِ اعظم کی حکمرانی آئی تو بحیرہ روم کے دیگر ممالک کے ساتھ تجارت کے وافر مواقع میسر آئے۔ اگرچہ ۶۳۶ء کی ابتدائی مسلم فتوحات کے بعد اِس خطے میں ایک ساسانی کالونی قائم ہُوئی لیکن ۱۰۹۸ء میں پہلی صلیبی جنگ تک بائبلوس میں خوشحالی واپس نہیں آئی تھی۔ ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی اس علاقہ پر فتحیاب ہُوا۔ ۱۳ویں صدی عیسوی میں بائبلوس کاؤنٹی آف طرابلس کا حصہ بن کر بڑے حد تک ایک آزاد صلیبی ریاست بن گیا۔ بعد ازاں رضا کارانہ طور پر مملوکوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد یہ شہر مزید کسی خرابی سے محفوظ رہا۔ ۱۵۱۶ء سے ۱۹۱۸ء تک یہ قصبہ اور پورا خطہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ رہا۔ اس وقت یہ شہر یونیسکو کا عالمی ثقافتی ورثہ ہے۔ یہ قدیم بائبلوس ہی تھا جہاں پر فونیشی، یونانی، لاطینی اور دیگر مغربی حروفِ تہجی تیار ہونا شروع ہُوئے۔ بیروت سے ۲۶ میل شمال میں واقع یہ شہر صدیوں انسانی رہائش کے نتیجے میں جمع ہونے والی معلومات کی بنا پر ماہرینِ آثارِ قدیمہ کے لیے بہت کشش رکھتا ہے۔

''حلب'' Aleppo ۶۰۰۰ ق م سے دُنیا کے قدیم ترین مسلسل آباد شہروں میں سے ایک ہے اور تاریخ میں دمشق سے بہت پہلے ایک اہم شہر کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ پرانے بابل اور قدیم آشوری سلطنت کے دَور میں اِس کا نام پہلی بار حلب کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اِس کا تذکرہ پہلی بار میسوپوٹامیا میں دریافت ہونے والی کیپفارم کی ٹھیکریوں میں ملتا ہے جو اِسے اموری ریاست ''یمہد'' کا حصہ بتاتی ہیں۔ حلب یمہد کے اہم اموری خاندان کا دارالحکومت بھی رہا۔ اِسے ۱۶ویں صدی قبل مسیح میں ہتیوں نے تباہ کر دیا تھا تاہم جب خطے میں ہتی طاقت ختم ہُوئی تو یمہد نے دوبارہ خود کو مستحکم کیا لیکن حوریتی سلطنت میتانی کے بادشاہ براتارنا Baratarna نے یمہد کے آخری بادشاہ الیوم الیما کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ یہ علاقہ تیسری صدی قبل مسیح کے آخری حصے میں اموریوں کے قبضے میں تھا۔ ۳۳۳ ق م میں اِسے سکندرِ اعظم نے فتح کیا۔ بعد ازاں اُس کے جرنیل سیلیوکس نکٹیر Seleucus Nicator نے ۳۰۱ اور ۲۸۶ ق م کے درمیان اِس جگہ بیروئیا Beroia کے نام سے ایک ہیلینک بستی قائم کی جو ۸۸ ق م تک سلوقی حکمرانی کے تحت رہی پھر اِسے رومی جرنیل پومپیو کے حوالے کر دیا گیا۔ ساسانی فارسیوں نے خسرو اوّل کی قیادت میں حلب کو لوٹا اور جلا دیا پھر اُنھوں نے ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں شام پر بھی قابو پالیا۔ ابوعبیدہ بن الجراح کے تحت مسلمانوں نے ۶۳۷ء میں حلب پر قبضہ کیا۔ حلب کی اِتنی طویل تاریخ بحیرہ روم اور میسوپوٹامیا کے درمیان تجارتی مرکز ہونے کے سبب سے تھی لیکن جب نہر سویز کا افتتاح ہُوا تو بہت سی تجارت کا رُخ سمندر کی طرف ہو گیا اور حلب میں سست روی کا آغاز ہُوا۔ صدیوں تک حلب شام کے علاقے کا سب سے بڑا اور قسطنطنیہ (اَب استنبول) اور قاہرہ کے بعد عثمانی سلطنت کا تیسرا بڑا شہر رہا۔

''دمشق''میں ساتویں صدی قبل مسیح سے آبادی کا پتہ چلتا ہے تاہم ۹۰۰۰ ق م سے تعلق رکھنے والے برادہ طاس میں آبادکاری کے آثار موجود ہیں حالاں کہ دُوسری صدی قبل مسیح تک دمشق کی دیواروں کے اندر بڑے پیمانے پر کوئی آبادکاری نہیں تھی۔ دمشق کو سب سے پہلے گیارھویں صدی قبل مسیح میں آرامیوں نے دستاویزی شکل دی۔ پہلے ہزار سال قبل مسیح کے آغاز تک یہاں کئی آرامی سلطنتیں قائم ہُوئیں۔ آرامی جو بغیر جنگ کیے شہر میں داخل ہُوئے، اُنھوں نے اِس کا نام ''دمشقو'' رکھا اور ابھی تک غیر ترقی یافتہ اور کم آبادی والے علاقے کی زرعی صلاحیت دیکھتے ہُوئے نہریں اور سرنگیں بنا کر دمشق میں پانی کی تقسیم کا نظام قائم کیا۔ اسی نظام کو بعد ازاں رومیوں اور اُمویوں نے بہتر کیا جو آج بھی شہر کے پرانے حصے کے پانی کے نظام کی بنیاد ہے۔ آٹھویں صدی قبل مسیح تک دمشق عملی طور پر آشوریوں کی لپیٹ میں آ کر ایک تاریک دَور میں داخل ہو گیا تاہم مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ ساتھ آرامی مزاحمت کا اقتصادی اور ثقافتی مرکز بھی رہا۔ ۵۷۲ ق م میں تمام شام کو نو بابلیوں نے فتح کر لیا تھا لیکن بابل کے تحت دمشق کی حیثیت نسبتاً نامعلوم رہی۔ سکندرِاعظم نے بھی دمشق کو فتح کیا لیکن اُس کے بعد دمشق بطلمیوں Ptolemaic اور سلوقیوں Seleucid کے درمیان لڑائی کا مقام بنا رہا۔ ۶۴ ق م میں رومی جرنیل پومپیو دمشق پر قابض ہُوا تو رومیوں نے دمشق کو دوبارہ ڈیزائن کیا۔ آج بھی دمشق کا پرانا حصہ رومن آثار کو برقرار رکھے ہُوئے ہے۔ دُوسری صدی عیسوی کے آغاز تک دمشق ایک بھرپور شہر بن گیا اور یہ شام کے رومی صوبے کے ساتھ خوشحال ہوا۔ جنوبی عرب، پالمیرا اور چین سے آنے والے تجارتی راستوں نے اِس کی اہمیت میں اضافہ کیا۔ خلیفہ عمرؓ کے دورِ خلافت میں خالد بن ولید نے ۶۳۴ء میں دمشق فتح کیا اور تب سے دمشق مسلم عرب کے ہاتھوں میں ہے۔

''نینوا''، جسے جدید دَور میں کویونجک Kouyunjik کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، بالائی میسوپوٹامیا کا ایک قدیم آشوری Assyrian شہر تھا جو ۶۰۰۰ ق م کے اوائل میں قائم کیا گیا اور اُس وقت یہ ایک عام کاشتکاری گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس شہر کو دیوی ''انانا'' کے لیے وقف کیا گیا تھا اور نینا اُس دیوی کے لیے سمیری اور اشوری ناموں میں سے ایک تھا۔ دریائے دجلہ پر سب سے بلند بحری مقام کے طور پر نینوا یورک شہر کی توسیع کے دوران تجارتی مرکز بن گیا۔ بحیرۂ روم اور بحرِ ہند کے درمیان دجلہ کو عبور کرنے والے تجارتی قافلوں کے لیے یہ ایک اہم سنگم تھا۔ اِس طرح مشرق اور مغرب کو متحد کرتے ہُوئے اس شہر نے بہت ترقی کی اور دولت کمائی۔ ۳۰۰۰ ق م تک کیش Kish تہذیب نینوا تک پھیل چکی تھی۔ نینوا کا علاقائی اثر ۲۹۰۰ ق م تا ۲۶۰۰ ق م کے دوران واضح ہونا شروع ہُوا اور دیکھتے ہی دیکھتے آشوری سلطنت کا دارالحکومت بن گیا اور کئی دہائیوں تک دُنیا کا سب سے بڑا شہر رہا تاوقتیکہ ۶۱۲ ق م میں بابلیوں اور فارسیوں کی اتحادی طاقت نے حاوی ہو کر اِس کی عظمت مٹا ڈالی اور پھر کبھی یہ شہر ایک سیاسی یا انتظامی مرکز کے طور پر نہ اُبھر سکا تاہم یہ ایک عیسائی بشپ کی نشست ضرور رہا مگر ۱۳ویں صدی عیسوی تک اِسے ترک کر دیا گیا۔ آج یہ جدید عراقی شہر موصل کے آدھے حصے کا ایک عام نام ہے جو دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ نینوا کے کھنڈرات موصل شہر کے مرکز سے دریائے دجلہ کے اُس پار موجود ہیں جس کی دیواروں کے اندر دو اہم ٹیلے ہیں جن میں سے ایک حضرت یونسؑ (یوناہ) کے مزار کی جگہ جانا جاتا ہے لیکن مرکزی دھارے کے بائبلی اسکالرز اِسے فرضی سمجھتے ہیں۔

''نیپور'' قدیم سمیر کے سب سے طویل عرصے تک رہنے والے مقامات میں سے ایک تھا جو قریباً ۵۰۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۸۰۰ عیسوی تک قائم رہا۔ یہ شہر بابل سے کوئی ساٹھ میل جنوب مشرق میں واقع تھا اور سمیری دیوتا اینلل Enlil کی خاص نشست تھی۔ تیسری صدی قبل مسیح کے اواخر میں نیپور کو اکادی حکمرانوں نے فتح کیا۔ اسلامی دَور میں بھی نیپور آباد رہا لیکن تب یہ نفر کے نام سے پہچانا گیا تاہم ۱۲۰۰ کی دہائی کے اوائل میں نیپور کو قطعی طور پر ترک کر دیا گیا۔

''بابل'' جدید دَور کے عراق کے اندر جنوبی میسوپوٹامیا میں دریائے فرات کے نچلے حصے پر واقع ایک قدیم شہر تھا۔ یہ اکادی بولنے والے علاقہ کا ایک اہم سیاسی اور ثقافتی مرکز تھا جہاں ۱۹ویں تا ۱۶ویں قبل مسیح میں پرانی بابلی سلطنت اور پھر ساتویں تا چھٹی قبل مسیح میں نو بابلی سلطنت قائم ہُوئی۔ ایک چھوٹے سے قصبے کے طور پر بابل کا قدیم ترین تذکرہ اکادی سلطنت سے ملنے والی ۲۲۱۷ تا ۲۱۹۳ ق م کے دوران کی ایک مٹی کی تختی پر ملتا ہے۔ بابل اُس وقت نہ کوئی بڑا شہر تھا نہ آزاد ریاست بلکہ باقی میسوپوٹامیہ کی طرح اکادی سلطنت کے تابع ایک مذہبی اور ثقافتی مرکز تھا۔ اکادین سلطنت کے بعد کچھ دہائیوں تک اس علاقہ پر گٹیان Gutian لوگوں کا تسلط رہا لیکن بعد ازاں اُر کے تیسرے شاہی خاندان نے بابل سمیت میسوپوٹامیا کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ قصبہ ۱۹ویں صدی قبل مسیح میں پہلی بابلی سلطنت کے عروج کے ساتھ ایک چھوٹی آزاد شہری ریاست کا حصہ بنا جسے اَب پرانی بابلی سلطنت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اموری Amorite بادشاہ حمورابی نے ۱۸ویں صدی قبل مسیح میں قلیل المدت بابلہ سلطنت کی بنیاد رکھی اور خود کو اس کا بادشاہ قرار دے کر بابل کو اس طرح ایک بڑا شہر بنایا کہ جنوبی میسوپوٹامیا بابل کے نام سے جانا جانے لگا اور مقدس شہر کی حیثیت سے اس نے نیپور Nippur شہر کو دھندلا دیا تاہم حمورابی کے بیٹے سمسو الونہ Samsu-iluna کے دَور میں سلطنت ختم ہو گئی اور بابل نے طویل عرصہ آشوری اور ایلامی بادشاہتوں کے تسلط میں گزارا۔ آشوریوں کے تباہ کرنے اور پھر اِسے دوبارہ تعمیر کرنے کے بعد بابل ۶۰۹ تا ۵۳۹ ق م تک کی مختصر مدت میں نو بابلی سلطنت کا دارالحکومت رہا۔ نو بابلی سلطنت کے زوال کے بعد یہ شہر پارتھین، رومن، ساسانی اور مسلم سلطنتوں کے زیرِ تسلط رہا۔ اس شہر کی آخری رہائش دسویں صدی

عیسوی ہے جب اِسے بابل کا چھوٹا گاؤں کہا جاتا تھا۔

سمیری بادشاہوں کی فہرست اِس مقولے سے آغاز ہوتی ہے کہ ''بادشاہی آسمان سے اُترنے کے بعد اریدو Eridu میں تھی''۔

خلیج فارس کے قریب مشرقی میسوپوٹامیا میں تل ابو شاہرین Tell Abu Shahrain کو مختلف نوشتہ جات میں اریدو کے طور پر پہچانا گیا ہے۔ اگرچہ روایتی تاریخ اس جگہ کا قیام پانچویں صدی قبل مسیح کے آس پاس بتاتی ہے تاہم پہلے شہر کے طور پر اِس مقام کی قدامت نوشتی حوالوں میں واضح ہے۔ اریدو سمیرین شہروں کے ایک اجتماع کا سب سے جنوبی حصہ تھا جو تقریباً ایک دُوسرے کے قریب واقع مندروں کے اردگرد پروان چڑھا۔ اِس شہر کے دیوتا اینکی Enki اور اُس کی ساتھی دمکینا Damkina تھے۔ یہ شہر عراق کے شہر الناصریہ کے جنوب مغرب کا علاقہ اور خطے کی قدیم ترین بستیوں میں سے ایک تھا اور تقریباً پندرہ میل لمبے اور بیس فٹ گہرے طاس کی قدرتی ریتلی پہاڑی پر واقع آٹھ ٹیلوں پر مشتمل تھا جسے ہزم نامی ایک پتھریلی چوٹی دریائے فرات سے الگ کرتی ہے۔ یہ طاس برسات میں ایک موسمی جھیل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے مشرقی کنارے سے حمار دلدل متصل ہے۔ کسی زمانے میں ایک نہر اریدو کو فرات سے جوڑتی تھی جس نے بعد میں راستہ تبدیل کر لیا۔

''اریدو'' کی بنیاد ۵۴۰۰ ق م میں ایسی جگہ رکھی گئی تھی جہاں کوئی سابقہ رہائش نہیں تھی۔ شاید اریدو ہی وہ شہر ہو جسے قابیل نے اپنے بیٹے حنوک کے نام پر آباد کیا لیکن اریدو کا نام حنوک کے فرزند ایراد کے نام کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ ممکنہ وقفے کے ساتھ یہ شہر نو بابلیوں تک آباد تھا جب کہ بعد کے زمانے میں یہ ایک ثقافتی مقام رہا۔ ابتدائی حکمران خاندان کے دَور کی ایک محل نما عمارت یادگار رہ گئی ہے۔ قبل از تاریخ دَور میں یہ شہر تیس ایکڑ رقبے میں پھیلا ہُوا تھا۔ اس مقام پر مٹی کی اینٹوں سے بنے مندر امر سین (۲۰۴۷۔۲۰۳۹ ق م) کے نامکمل زیگورت Ziggurat کی نشاندہی کرتے ہیں۔ زیگورت ۲۲۰۰ تا ۵۰۰ ق م تک میسوپوٹامیا (عراق) کے بڑے شہروں میں اہرام کی طرز پر تعمیر کیے گئے خصوصی مذہبی ڈھانچے کا نام ہے جس کا مرکزی اندرونی حصہ مٹی کی اینٹوں اور بیرونی حصہ پکی اینٹوں سے ڈھکا ہُوا ہوتا تھا۔ اریدو شہر ۲۲ویں اور ۲۱ویں صدی کے دوران سرگرم تھا جس کا پتہ شاہی عمارات کی اینٹوں پر کنندہ سرگرمیوں سے ہوتا ہے خصوصی طور پر اُر کے بادشاہ اُر نمو کے زیگورت پر کنندہ عبارات، جس نے اریدو میں دیوتا اینکی کا مندر تعمیر کرایا تھا۔ لگاش Lagash کے ابتدائی حکمران اینمیٹینا (Enmetena 2400BC) کے مجسمے پر بھی لکھا ہے کہ اُس نے اریدو کے دیوتا بادشاہ اینکی کے لیے ابزوپاسرہ Ab-Zupasira مندر تعمیر کرایا تھا۔ الولیم Alulim اور الالنگر Alalngar دُنیا کے اِس پہلے شہر اریدو کے پہلے حکمران تصور ہوتے ہیں۔ بعدازاں بادشاہی ایک اور شہر بدتبیرہ BadTibira منتقل ہُوئی جہاں اگلے تین بادشاہوں نے حکومت کی۔ آخری تین بادشاہوں میں سے ہر ایک نے بالترتیب لارک Larak، سپر Sippar اور سوروپک Suruppak میں حکومت کی۔ شہر اُر Ur کے پہلے خاندان کے ایک حکمران ایلولو Elulu کا ۲۶۰۰ ق م کا لکھا ہُوا ایک نوشتہ بھی اریدو میں پایا گیا ہے۔ اُر حکمرانوں کے زوال کے بعد دُوسرے ہزار سالہ دَور کے اوائل میں لارسا حکمرانوں اشی اور اشمے نے اِس علاقہ پر قبضہ جمایا تاہم اریدو کی فعالیت متاثر نہ ہُوئی۔

''اُر'' قدیم میسوپوٹامیا میں ایک اہم سمیری شہری ریاست تھی جو حالیہ عراق کی ذی قار گورنری میں جدید تل المقیر کے مقام پر واقع تھی۔ اگرچہ اُر کسی زمانہ میں خلیج فارس پر فرات کے دہانے کے قریب ایک ساحلی شہر تھا لیکن ساحلی پٹی بدل جانے کی وجہ سے یہ علاقہ اَب فرات کے جنوبی کنارے پر جدید شہر الناصریہ سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس شہر کا تعلق ۳۸۰۰ ق م کے زمانے سے ہے۔ اس کا سرپرست چاند کا دیوتا ننا Nanna اور پہلا بادشاہ توتوز Tuttues تھا۔ ۱۹۳۰ء میں اِس جگہ کی کھدائی اور اُر کے زیگورت کی جزوی بحالی کے وقت ننا کا مندر موجود تھا جو ۲۱ویں صدی قبل مسیح میں تعمیر کیا گیا تھا اور چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے آخری بادشاہ نبونیڈس Nabonidus نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔

سمیرین ثقافت کا مظہر یہ شہر ۵۰۰ ق م تک آباد رہا۔ آثارِ قدیمہ کی دریافتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُر میسوپوٹامیا کے میدانی علاقے میں ایک بڑا شہری مرکز تھا، خاص طور پر شاہی مقبروں کی دریافت نے اس کی شان وشوکت کی تصدیق کردی ہے۔ یہ مقبرے ۲۵ویں اور ۲۴ویں صدی ق م میں قیمتی دھاتوں اور نیم قیمتی پتھروں سے بنی پُرتعیش اشیا کا ایک خزانہ ہیں جو کانسی کے ابتدائی دَور میں اُر کی معاشی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ شاہی قبرستان کی شاندار باقیات سے محسوس ہوتا ہے کہ اُر کے پہلے شاہی خاندان کے پاس بے پناہ دولت اور طاقت تھی۔ بعد ازاں اُر کا شہر سارگون کی سرکردگی میں سامی زبان بولنے وال اکادی سلطنت کے زیرِ اثر آ گیا۔ یہ وہ دَور تھا جب سامی بولنے والے اکادی باشندے میسوپوٹامیا میں داخل ہُوئے اور سمیریوں سمیت قدیم قدیم نزدیکی مشرق کے زیادہ تر حصہ پر غالب آ گئے۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ اُر ۳۸۰۰ ق م سے کہیں پہلے آباد ہو چکا تھا لیکن اُن آثار کو مٹی کی ایک تہہ نے ڈھانپ دیا تھا جسے طوفانِ نوح کا نتیجہ بھی کہا جاتا ہے۔

''یوروک'' (عربی میں اوروک) شہر جسے آج وارکا کے نام سے جانتے ہیں، ایک قدیم شہر تھا جو دریائے فرات کے مشرقی پہلو میں فرات کے سوکھے ہُوئے راستے پر موجود تھا۔ یہ جگہ شہر اُر کے شمال مغرب میں کوئی ۶۷ میل اور جدید عراق کے علاقہ سماوہ المثنیٰ سے ۱۹ میل مشرق میں ہے۔ یوروک نے چوتھی صدی قبل مسیح کے وسط میں سمیر کی ابتدائی شہر کاری میں اہم کردار ادا کیا۔ ۳۱۰۰ ق م کے اردگرد اس شہر میں

چالیس ہزار رہائشی تھے اور اِس کے گردونواح میں آباد اسی سے نوے ہزار باشندے اِسے اُس وقت دُنیا کا سب سے بڑا شہری علاقہ بناتے تھے۔ شاہ گلگامش ۲۷ویں صدی ق م میں یوروک پر حکومت کرتا تھا۔ ۲۰۰۰ ق م میں ایلام کے خلاف بابل کی جدوجہد کے تناظر میں یہ شہر اپنی اہمیت کھو بیٹھنے کے باوجود ۳۳۳ء تک آباد رہا تاوقتیکہ ۶۳۳ء کی اسلامی فتح سے کچھ قبل اِسے ترک کر دیا گیا۔ آج کے عراق کے نام پر بھی یوروک سے اخذ ہونے کا گمان گذرتا ہے۔ افسانوی ادب میں یوروک گلگامش کے دارالحکومت کے طور پر مشہور تھا۔ مغربی اسکالر یوروک کی شناخت بائیبل کے ''ایریک'' کے طور پر بھی کرتے ہیں جو نمرود کا شنار میں بسایا ہُوا دُوسرا شہر تھا۔ پہلے شہروں میں سے ایک ہونے کے علاوہ یوروک ۴۰۰۰ تا ۳۲۰۰ ق م کے ۸۰۰ برسوں کے دوران چھوٹے زرعی دیہاتوں سے ایک بڑے شہری مرکز کی طرف بڑھا جس میں کل وقتی بیوروکریسی، فوجی اور عوامی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ یوروک کے ساتھ اگرچہ دیگر بستیاں بھی موجود تھیں لیکن یوروک اُن کے مقابلے میں نمایاں طور پر بڑا اور زیادہ پیچیدہ شہر تھا۔ سمیری تاجروں اور نوآبادیات کے ذریعے برآمد کی گئی یوروک دَور کی ثقافت کا اثر اِردگرد کی تمام آبادیوں اور لوگوں پر پڑا جنھوں نے آہستہ آہستہ مسابقتی معیشتوں اور ثقافتوں کو جنم دیا جس کے نتیجے میں بالآخر یوروک اپنی فوجی طاقت کے ذریعے طویل فاصلوں پر موجود اپنی کالونیوں پر کنٹرول برقرار نہیں رکھ سکا۔

''لارسا'' یوروک سے سولہ میل کے فاصلے پر سمیری سلطنت کا ایک اہم شہری علاقہ تھا جو سورج دیوتا اُتوUtu کے فرقہ کا مرکز تھا۔ اپنی زیادہ تر تاریخ کے لیے لارسا بنیادی طور پر دیوتا اُتو کے لیے مذہبی مقام رہا۔ لارسا کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بابل کی ریاضی پر مشتمل متعدد ٹھیکریوں کا مآخذ ہے۔ تاریخی طور پر لارسا لگاش کے ابتدائی خاندانی حکمران اینا تم(Eannatum 2500-2400BC) کے دَور میں ہی وجود میں آچکا تھا جس نے اِسے اپنی سلطنت سے جوڑ لیا۔ بعدازاں اُس کے بھتیجے اینٹیمینا (Entemena) نے لارسا میں اُتو دیوتا کا اختیار بحال کیا۔ لارسا کی تصدیق اکادی بادشاہ سارگون Sargon کی بیٹی این ہدوانا Enhuduanna کے ایک بھجن سے بھی ہوتی ہے۔ یہ شہر اسین لارسا دَور (۲۰۲۵_۱۷۶۳ ق م) میں ایک سیاسی قوت بنا۔ یہ زمانہ اُر کے تیسرے خاندان کے اختتام اور بابل کے حکمران حمورانی کی میسوپوٹامیا میں فتوحات کے بعد پہلی بابلی ریاست کے قیام کا ہے۔ اُر کے تیسرے خاندان کے خاتمے کے بعد ۲۰۰۰ ق م میں تیسرے خاندان کے آخری بادشاہ ابی سین IbbiSen کے ایک اہلکار اشبی ایرا IshbiErra اُر کے تیسرے خاندان کے جانشین کی حیثیت سے اسین منتقل ہو گیا اور وہاں ایک حکومت قائم کر لی۔ وہیں سے اُس نے اُر کے ساتھ یوروک اور لگاش کے شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جو لارسا کے تابع تھے۔ اسین کے بعد کے حکمرانوں نے لارسا پر حکمرانی کے لیے گورنر مقرر کیے۔ ایسا ہی ایک گورنر گنگنم Gangunum تھا جس نے آخر کار اسین سے ناطہ توڑ کر لارسا میں ایک آزاد خاندانی حکومت قائم کی اور اپنی حکومت کو جائز بنانے اور اسین کو دھچکا لگانے کی غرض سے اُر شہر پر قبضہ کر لیا۔ اِس کے علاوہ دُور دراز واقع ایلام کے شہر انشان Anshan اور لارسا کے قرب وجوار کی شہری ریاستوں جیسے کہ مالجیم Malgium کو بھی شکست سے دوچار کیا۔ یوں اسین نے خلیج فارس کے راستے تجارت کا مرکزی اور منافع بخش راستہ کھو دیا۔ یوں تو لارسا وقت کے ساتھ ساتھ طاقتور ہُوا لیکن یہ کبھی بھی پھیل کر ایک بڑے علاقہ پر محیط نہ ہو سکا۔ اپنے عروج کے زمانہ میں لارسا نے دس سے پندرہ ریاستوں کو کنٹرول کیا تاہم حمورابی کے ہاتھوں شکست کے بعد لارسا ایک معمولی جگہ رہ گیا۔

''اُمہ'' Umma بھی سمیر کا ایک قدیم شہر تھا۔ حال ہی میں تجویز کیا گیا ہے کہ یہ مقام اُم العقریب کے جنوب مشرق میں واقع تھا اور یہ دونوں ابتدائی خاندانی بادشاہ گیساGissa کے شہر تھے۔ جوکھا اور کیان اِن کے قریبی قصبے تھے۔ اُمہ کے بعد جوکھا ہی کو عروج حاصل ہُوا۔ اُمہ کے دیوتاؤں کا نام سارہ اور ننورا Ninura تھے۔ اکادین سلطنت کے تحت اُمہ ایک بڑے طاقت اور معاشی مرکز تھا جس کا مقابلہ صرف ''ادب'' اور ''یوروک'' نے کیا۔ ''اُر'' کے تیسرے خاندان کے تحت مقرر کیے گئے گورنروں کے زمانے میں اُمہ ایک اہم صوبائی مرکز بن گیا۔ پبلگا گالتوکو Pabilgagaltuku تقریباً ۲۵۰۰ ق م میں اُمہ کا گورنر تھا۔ اپنے عروج کے زمانے میں اُمہ کے لگاش کے ساتھ طویل سرحدی تنازعات رہے حتیٰ کہ لگاش کے اُر نانشے Ur Nanshe نے پبلگا گالتوکو کو گرفتار کر لیا۔

''لگاش'' Lagash ایک قدیم شہری ریاست تھی جو دریائے فرات اور دجلہ کے سنگم کے شمال مغرب میں یوروک سے مشرق اور عراق کے جدید قصبے الشطر ہ سے لگ بھگ چودہ میل مشرق میں واقع ہے۔ ۲۹۰۰ تا ۲۶۰۰ ق م میں لگاش کے مقام پر لوگوں کی رہائش اختیار کرنے کے آثار ملتے ہیں البتہ ۲۵۰۰ تا ۲۳۳۴ ق م میں پہلے شاہی خاندانی نے اِس علاقہ پر قبضہ جمایا جس کے بعد لگاش کئی صدیوں تک اکادی سلطنت کے زیر تسلط رہا۔ اِس کے بعد لگاش بڑی حد تک ویران تھا جب تک کہ دُوسری صدی قبل مسیح میں سلوکڈ Seleucid دَور کا قلعہ تعمیر نہیں ہُوا۔ این ہیگل En-hegal کو لگاش کا پہلا حکمران مانا جاتا ہے لیکن اُس کی تاریخ اور حیثیت دونوں متنازعہ ہیں۔ تقریباً ۲۳۰۰ ق م میں اکاد کے سارگون نے یوروک اور اُر فتح کرنے کے بعد لگاش سے لے کر سمندر تک کے علاقے کو تباہ و برباد کر دیا۔ اِس مہم میں اُن نے مجموعی طور پر ۳۴ شہروں پر فتح حاصل کی۔

✧✧✧

پروفیسر محمد فرید کی ہندکو ادبی خدمات: ایک جائزہ

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

ادبی دنیا میں کسی بھی زبان و ادب کے شعبہ ...ں سے براہ راست وابستہ شعرا و ادباء کے ادبی و علمی کارنامے نمایاں تو اکثر و بیشتر جرائد و رسائل کے ...ے قارئین کے مطالعے میں آتے ہی رہتے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر معلومات میں اضافہ اور متعلقہ ادبی شخصیت کے کام سے واقفیت ہو جاتی ہے مگر کوئی خالصتاً سائنسی علوم کا استاد، جس نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک طبیعات کا علم لوگوں تک پہنچانے اور اپنے سائنسی علم میں روز افزوں اضافہ کرنے میں گزاری ہو، جب ہمارے سامنے ایک بڑے شاعر اور عمدہ ادیب کے روپ میں آتا ہے تو ایک گونہ حیرت تو ہوتی ہے۔ پھر اس حیرت میں اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب ہم ایسے شاعر و ادیب کے ادبی سفر میں عمومی اور روایتی شاعرانہ روش کے ساتھ چلتے چلتے اچانک ایک بڑی اور مشکل تبدیلی دیکھتے ہیں جو کہ بہت کم لکھنے والوں کے پاس دیکھی جا سکتی ہو۔ خیر علم کی دنیا اتنی وسیع ہے کہ اس احاطہ نہیں کیا جا سکتا اور پھر محنت، لگن اور جہدِ مسلسل وہ پیمانے ہیں جو خود کبھی نہیں بھرتے مگر متجسس کی تشنگی کو مٹانے کا ساماں مہیا کر دیتے ہیں۔ پروفیسر محمد فرید کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ نظر آتا ہے۔

جنابِ موصوف نے وطن عزیز کے مشہور صحت افزا مقام اور سیاحتی حوالوں سے ایک اہم شہر ایبٹ آباد میں پچھلی صدی (عیسوی) کے وسط کی دہائی میں ایک علمی خانوادے میں آنکھ کھولی، بنیادی سے لیکر ثانوی، اعلیٰ ثانوی اور اعلیٰ ترین تعلیم اسی شہر کے مایہ ناز تعلیمی اداروں سے حاصل کرنے کے بعد طبیعات جیسے اہم سائنسی علم کے استاد کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج میران شاہ سے بطور لیکچرار اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر محکمانہ تبدیلیوں کے باوصف پاراچنار، بونیر، پشاور، اور پھر اپنے ہی شہر اور اپنی ہی مادر علمی گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ایبٹ آباد میں فزکس کے پروفیسر کے طور پر ہزاروں علم کے متلاشیوں کی علمی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے گورنمنٹ کالج ہری پور کے پرنسپل کے اعلیٰ عہدے سے سال ۲۰۰۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ مگر انکا علمی ترسیل کا عمل ابھی تک جاری ہے اور ایک عالمی شہرت یافتہ تعلیمی ادارے (ماڈران ایج پبلک سکول و کالج ایبٹ آباد) میں گزشتہ چودہ برسوں سے ان گنت طلباء اور دیگر تشنگانِ علم کی رہنمائی فرما رہے ہیں۔

پروفیسر محمد فرید کا ادبی سفر یوں تو اردو غزل سے طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع ہو چکا تھا مگر اس کی رفتار میں اسوقت تیزی آئی جب وہ ایبٹ آباد کالج میں تعینات ہوئے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اب انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان ہندکو کی طرف توجہ دی اور زیادہ وقت اسی زبان کے شعری اور نثری ادب کی پرداخت پر صرف کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ اردو ادب اپنی ترقی کے اعتبار سے ایک اونچی سطح پر موجود ہے جبکہ ہندکو زبان ابھی لوک ادب کی حد سے آگے نہیں جا سکی۔ اس ادارے میں انہیں معروف شاعر و ادیب پروفیسر آصف ثاقب اور پروفیسر یحییٰ خالد جیسے اہلِ قلم کی رفاقت میسر تھی جبکہ کالج سے ہٹ کر مایہ ناز شاعر و ادیب جناب سلطان سکون کی دوستی اور ادبی ماحول۔ چنانچہ انھوں نے ان سب سے مل کر ہندکو ادب کی ترویج و ترقی اور اسے کتابی صورت میں لانے کی سعی جمیل کی ٹھان لی اور اس کام کو آگے بڑھانے کی غرض سے ''ہندکو ادبی سنگت'' کے نام سے ایک ادبی تنظیم میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس تنظیم کا بنیادی مقصد ہی ہندکو میں لکھی جانے والی کتابوں کی اشاعت تھا۔ چنانچہ اس پلیٹ فارم سے انہوں نے ۱۹۸۳ء میں پہلی کتاب ''دکھ سنجھیالے'' کے عنوان سے شائع کروائی جس میں ان کے علاوہ دیگر چھے شعرا کا کلام شامل تھا۔ اس ادبی سنگت نے آگے چل کر اور بھی کئی ہندکو شعری و نثری کتب کی اشاعت کا اہتمام کیا اور یوں ہندکو ادب کی باقاعدہ کتابی صورت دیکھنے میں آئی۔

ان کی ہندکو ادب کی اشاعتی کوششیں جاری رہیں اور اس تنظیم کے ساتھ ساتھ مقامی اخبارات کے ادبی ایڈیشن کا بھی بندوبست کیا جاتا رہا جس کی ادارت پروفیسر یحییٰ خالد کے ذمے تھی۔ روزنامہ شمال ایبٹ آباد کے چیف ایڈیٹر جناب نیاز پاشا جدون کے تعاون سے ایک مستقل ہندکو ادبی صفحہ ''پچھانڑ'' کے نام سے کئی برس تک ہفتہ وار شائع ہوتا رہا جس میں دیگر ہندکو لکھاریوں کے ساتھ ساتھ پروفیسر موصوف کی ہندکو شاعری اور افسانے شائع ہوتے رہے۔ شمال کے علاوہ روزنامہ ''آج'' اور کئی دوسرے ہفت روزہ اخباروں میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ جبکہ انہوں نے اپنے کلام کو کتابی صورت میں بھی شائع کرانے کا وقفے وقفے سے عمدہ اہتمام کئے رکھا۔ جس کے نتیجے میں ابھی تک ان کے مندرجہ ذیل آٹھ شعری مجموعے منظر عام پر آ کر قارئین سے خوب داد پا چکے ہیں:

ا۔ دکھ سنجھیالے: یہ ہندکو ادبی سنگت کے زیر اہتمام ۱۹۸۳ء میں شائع ہونے والا ہندکو شاعری پر مشتمل مجموعہ ہے جس میں پروفیسر محمد فرید کی دس غزلیں اور کئی نظمیں شامل ہیں۔ یہ کتاب ان کی

شاعری کا پہلا پہلا نقش ابھارتی نظر آتی ہے۔ جس کے بعد ان کی شاعرانہ اڑان اور ادبی مقام کا آسانی سے تعین ہوا اور پھر ان کی شاندار کتابیں سامنے آتی گئیں اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

۲۔ سنجھ سویل: یہ شعری مجموعہ بھی ہندکو ادبی سنگت کے زیرِ اہتمام ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا جس میں فرید صاحب کی جوانی کا کلام (غزلیں اور نظمیں) شامل ہیں، اس کتاب پر پروفیسر آصف ثاقب اور پروفیسر یحیٰ خالد کے دو خوبصورت مضامین بھی لکھے گئے ہیں جن سے موصوف کی ادبی پرواز اور سوچ و فکر کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ شعری لوازمات اور فنی باریکیوں پر ان کی دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

۳۔ چِنے نُقطے: جناب فرید کا یہ تیسرا شعری مجموعہ اپنی مثال آپ ہے کیونکہ ہندکو میں حرفی کی صنف پر ایک مکمل اور روح پرور مجموعہ کلام ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس پوری کتاب میں حرفی کے انداز پر قطعات شامل کئے ہیں جنہیں پڑھ کر پنجابی کے صوفی شعرا کی یاد بھی تازہ ہوتی ہے اور ہندکو میں حرفی کی صنف کا عمدہ نمونہ بھی سامنے آتا ہے۔ اس کتاب پر معروف محقق، نقاد اور استادِ علم و فن جناب صوفی عبدالرشید کا تفصیلی مضمون جناب فرید کی علمی و ادبی حیثیت کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ کتاب بھی ہندکو ادبی سنگت کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ چھپ نماشاں: ہندکو میں چھپ نماشاں کا مطلب گہری شام کا ہے۔ اس نام سے ہی شاعر کے اندر کا حال جھلکتا نظر آتا ہے۔ اس کتاب کی شاعری کا آہنگ بھی کافی اور ہندکو چار بیتے کا امتزاج نظر آتا ہے مگر موضوع کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے کیونکہ اس میں زیادہ تر سائنسی موضوعات کو محور بنایا گیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں مختلف سائنسی اصطلاحات کو ہندکو میں بیان کیا گیا ہے جیسے الیکٹران کے لیے منفی ذرہ، ایٹم کے لیے جوہر، نیوکلیس کیلیے مرکز اور اسی طرح کے مزید سائنسی ناموں کیلیے ہندکو زبان کی اصطلاحیں ایجاد کی گئی ہیں جو کہ کسی شاعر کے لیے ایک کارنامے سے کم نہیں۔ یہ کتاب بھی ہندکو ادبی سنگت کے زیرِ اہتمام ۱۹۹۷ء میں زیورِ اشاعت سے آراستہ ہوئی۔

۵۔ ترِ گے: ترِ گے جیسا کہ نام سے ہی واضح ہوتا ہے۔ یہ تین مصرعوں والی مختصر نظموں پر مشتمل پروفیسر محمد فرید کا ایک نیا تجربہ ہے۔ ویسے تو اردو میں ثلاثی اور جاپانی ہائیکو اور پھر اردو، پنجابی اور ہندکو میں ماہیہ ایسی اصناف ہیں جن میں تین تین مصرعے ہوتے ہیں مگر ترکے ان تینوں سے اس لیے الگ ہیں کہ ان کی ہیت بالکل جدا ہے۔ اس نئی صنف میں جناب فرید نے پہلے دو مصرعے چار فعلن اور تیسرا مصرعہ تین فعلن پر رکھا ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ پہلے دونوں مصرعے آپس میں ہم آہنگ جبکہ تیسرا ان سے الگ ہے مگر رباعی کی طرح حاصل اولین کے طور پر رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بہت بڑا کام بھی ہے اور ہندکو ادب میں ایک نئی صنف کی ایجاد بھی۔ یہ اہم کتاب بھی ۱۹۹۹ء میں ہندکو ادبی سنگت نے شائع کروائی۔

۶۔ برگی چھاں: جناب فرید کی چھٹی کتاب برگی چھاں کے نام سے ۱۹۹۹ء میں ہندکو ادبی سنگت کے زیرِ اہتمام منصۂ شہود پر آئی جو کہ خالصتاً غزل پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں جناب فرید کی غزل اپنے اوجِ کمال پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ بھی جناب صوفی عبدالرشید صاحب نے لکھا ہے جو کہ ہر ایک کو دعوت مطالعہ دیتا پھرتا ہے۔ برگی چھاں کا ہندکو زبان میں مطلب ہے کچی پکی چھاؤں یا وہ چھاؤں جو پوری طرح سایہ نہ کر رہی ہو (اردو میں شاید اسے دھوپ چھاؤں بھی کہا جاتا ہے)

۷۔ چن لویلاں: لویل خالصتاً ہندکو زبان کا لفظ ہے جس کا درست تلفظ جاننے کے لیے انگریزی کے حروف سے مدد لی جا سکتی ہے (laveel) جو کہ اس منظر کو ظاہر کرتی ہے جس میں منبع نظر آئے بغیر روشنی موجود ہو۔ یوں چن لویلاں کا مطلب چاند نظر آئے بغیر روشنی کی موجودگی ہوا۔ یہ بہت خوبصورت مجموعہ کلام ہے جس کی اشاعت مثال پبلشرز فیصل آباد سے ۲۰۰۱ء میں کروائی گئی ہے۔ اس مجموعہ کلام میں ہندکو چار بیتہ کے آہنگ میں نظمیں شامل ہیں جو کہ اپنی اٹھان اور موضوعات کے اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہیں۔ جبکہ کچھ ترکے، اور ماہیئے بھی اس کتاب کی اہمیت کو چار چاند لگاتے نظر آتے ہیں۔

۸۔ سیتی دی سیت: ہندکو میں سیت کا لفظ وقت کے چھوٹے سے چھوٹے وقفے کیلیے استعمال ہوتا ہے جسے اردو میں پل یا لمحے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سیتی دی سیت کو اگر اردو میں دیکھیں تو یہ ایک طرف تو زندگی کا پلک جھپکنے میں گزر جانا ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف انسان کو ملنے والی مہلت کی تنگ دامنی اور پھر دنیا کی بے ثباتی کو۔ یوں ایک عارفانہ سوچ رکھنے والے شاعر کی شناخت بھی ہے اور کلام کے مطالعے کے بعد اس حقیقت کا اعتراف بھی کہ جناب فرید نے انسانی زندگی اور پھر کائنات کے رموز و اسرار کو جاننے کی سعی کر رکھی ہے اور بہت کچھ حاصل کر لینے کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ کر اوروں کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دنیا، مال و متاع اور اسباب سب کچھ عارضی ہے۔ انسان کا یہاں قیام بس پل دو پل کا ہے۔ جس کے لیے تیاری مقصود ہے۔ اس مجموعے میں صوفیانہ کلام بھی موجود ہے اور ثقافتی حوالے بھی۔ ہندکو ادب میں ایک اور نئی صنف 'ترویہ' کا تجربہ بھی ہے اور خوبصورت غزلیں اور نظمیں بھی۔ یہ کتاب ۲۰۲۱ء میں ڈاکٹر عبدالواجد تبسم کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے جس کا بیک پیج ڈاکٹر یوسف خشک کے تبصرے سے مزین ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان شائع شدہ تصانیف کے علاوہ ان کی زیرِ طبع کتابوں کی بھی ایک

لمبی فہرست ہے، جن میں سے دو کتابیں 'وادین' اور 'تہہ در تہہ' تکمیل کے مراحل میں ہیں۔ جو کہ ایک ہندکو اور دوسری اردو نثر (مائیکرو فکشن) پر مشتمل ہے۔

پروفیسر محمد فرید کے کلام کا مجموعی فکری وفنی جائزہ:

جناب فرید کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ہمیں بیک وقت بہت سی جہتوں کا پتہ چلتا ہے جن میں سب سے اہم ان کا صوفیانہ طرز فکر ہے۔ شاید اسکی بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود ایک ماہر طبیعات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جہاں دیدہ، وسیع المطالعہ شخصیت بھی ہیں۔ سائنسی علوم کے ماہرین (خصوصاً اسلامی تعلیمات سے شغف رکھنے والوں) کے لیے فطرت کو سمجھنا اور اس کے رموز واسرار کو جاننا زیادہ آسان ہوتا ہے وہ اس کی ساخت اور اس کے قوانین کی حقانیت سے علمی اور تجرباتی دونوں حوالوں سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ اور پھر ان کا یقین ان تمام مظاہر کے خالق یکتا کی قدرت کاملہ پر نہایت پختہ ہوتا ہے۔ اور اس ذات وحدہ' لاشریک کے قبضہء قدرت میں ہر چیز کے ہونے پر یہی پختہ یقین اگلی منزل پر انسان کو صوفیانہ سوچ اور طرز فکر کی جانب مائل کر دیتا ہے اور پھر انسان پر کائنات کے چھپے راز افشا ہونے لگتے ہیں۔ شعرا کے نزدیک اس کیفیت کا محسوس کرنا اور اس میں رہ کر شعر کہنا صوفیانہ شاعری پر منطبق کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو پروفیسر محمد فرید کے ہاں ایسے اشعار کی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔ ان کی کوئی بھی تصنیف اٹھالیں، حمد اور نعت کے عمدہ نمونوں کے ساتھ ساتھ آپ کو جابجا صوفیانہ رنگ میں رنگی غزلیں، نظمیں اور دیگر اصناف سخن کے اعلی نمونے نظر آئیں گے۔ مضمون کی طوالت سے دامن بچاتے ہوئے ذیل میں ان کے چند اشعار بطور نمونہ اردو ترجمے کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں:

رزق اے اس دا تھوڑا، جیہڑا آپڑاں تھوڑے
چھوڑ کے اُساں، رشتہ دل دا غیراں دے نال جوڑے
منہ دا ذیقہ کوڑا رہندا پہیڑے گھٹ جے کوڑے
یار فریدا! ہوندا خجل، دنیا دا ہر جو دوڑے

اردو ترجمہ: رزق اسی کا کم ہوتا ہے جو خود اپنا رزق (برے اعمال کی وجہ سے) کم کر دیتا ہے۔

یعنی جو اللہ پاک کو چھوڑ کر غیروں سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ اسی کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے جو کڑوے گھونٹ پیتا ہے۔ یار فرید! وہی رسوا ہوتا ہے جو دنیا کے پیچھے دوڑتا ہے۔

س سواری اُتھے جُلسی جتھے جُلدے سارے
چٹے چیڑے پا کے جُلساں، جُلساں اگلے کہارائے
چھت سرے دی چلاں ہوسن، اُتے تھپے گارے
یار فریدا! نھیریاں ڈُب کے پھلسن رنگ نظارے

اردو ترجمہ: سواری آخر وہاں جائے گی جہاں جائینگے سارے۔ سفید لباس (کفن) پہن کر جائینگے کیوں کہ اگلے گھر جانا ہے۔ جہاں سر پر پتھر کی سلوں کی چھت ہوگی جس کے اوپر مٹی کا گارا تھاپا ہوگا۔ یار فرید! اس اندھیرے میں ڈوب کر (دنیا کے) سارے رنگ اور نظارے بھول جائیں گے۔

مندرجہ بالا اشعار جناب فرید کی صوفیانہ شعری روش کی صرف ہلکی سی جھلک کے طور پر پیش کیے گئے ہیں جبکہ ان کے کلام میں جابجا اسی نوعیت کے صوفیانہ و عارفانہ مزاج کے حامل متعدد اشعار بلکہ پوری پوری نظمیں، چار بیتے، قطعات، تروپے، ترکے اور ماہیئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں اگر ان کی کتاب ''چھپ نماشاں'' میں شامل حمد شریف کا ذکر نہ کیا جائے تو مضمون ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس حمد شریف کا عنوان ہے ''رب آں'' یعنی رب کو۔ اس حمد شریف کو پورا پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس عنوان کی حمد شریف کے ساتھ کیا مناسبت ہے۔ اس حمد شریف کی پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کتاب ہذا کے پندرہ صفحات کا احاطہ کئے ہوئے ایک طویل نظم کی صورت میں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے مصرعوں کی تعداد ۲۶۵ ہے اور پہلے دو اشعار کے علاوہ نو نو مصرعوں کے ۲۹ بندوں پر مشتمل ہے۔ میں اگر اپنے محدود مطالعے کے زیر اثر یہ کہوں کہ میں نے اس سے پہلے اتنی طویل حمد شریف ہندکو کے کسی مجموعے میں نہیں دیکھی تو بیجا نہ ہوگا۔

کلام فرید کا ثقافتی رنگ:

شاعر ایک حساس دل اور ہمدرد سوچ رکھنے والا انسان ہوتا ہے، اسے اپنے ارد گرد کے حالات اور اپنے رہن سہن سے خاص رغبت اور محبت ہوتی ہے، اسے جب اپنی ثقافت کمزور ہوتی اور اس کی اعلی قدریں معدوم ہوتی نظر آتی ہیں تو اس کا قلم خاموش نہیں رہ سکتا اور کچھ نہ کچھ کہہ جاتا ہے، چاہے وہ اس وقت کے لحاظ سے ہو یا شاعر کی نظر مستقبل کے بننے یا بگڑنے پر ہو۔ جناب فرید بھی اپنی ثقافت سے خوب مانوس دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے کہیں تو وہ پتن سے پانی بھرنے کے مناظر کا نقشہ کھینچتے ہیں اور کہیں مکان اور اسکی کچی دیواروں کے گرنے سے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں۔ کہیں وہ سبز درختوں کی کٹائی پر آزردہ ہیں اور کہیں وہ اپنے ٹہارے (کچے اور بغیر دروازے کے برائے نام مکان جو کہ اکثر گاؤں کے لوگ بارش وغیرہ سے بچنے کے لیے اپنی غیر مزروعہ زمین میں بناتے ہیں اور سخت دھوپ یا بارش کی صورت میں تھوڑی دیر کے لیے خود یا اپنے جانوروں کو ایک اوٹ سی مہیا کرتے ہیں) کی اہمیت کو اجاگر کرتے نظر آتے ہیں۔

چُپ چپیتا مارے گیٹا، لگّے کہڑے اُتے
مُڑ کے دیخاں مُش مُش کردا بیٹھا پڑے اُتے

اردو ترجمہ: خاموشی سے ایک چھوٹا سا کنکر یوں پھینکے کی سیدھا جا کر میرے گھڑے پر لگے۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھوں تو ایک بڑے پتھر پر بیٹھا مسکرانے لگے۔ (جناب فرید نے اس شعر میں ہندکو ثقافت کا وہ رنگ نمایاں کیا ہے جو ہر ایک کو بھانے والا ہے اور پھر

حقیقت سے بھی بہت قریب ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جنابِ فرید ایک پتن کے پاس بیٹھے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک چاہنے والا اپنے محبوب کو متوجہ کرنے یا اس پر اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لئے ایک کنکری اٹھا کر اس کے سر پر اٹھائے گھڑے پر بڑی احتیاط سے پھینکتا ہے کہ وہ صرف گھڑے پر ہی جا کر لگے، یہاں احتیاط اور مہارت دونوں کا عمل دخل ہے ورنہ کنکری محبوب کے جسم پر بھی پڑ سکتی ہے جس سے اس کی ناراضگی کا احتمال بھی ہے۔ اور آگے دیکھئے کہ جب محبوب کنکری کی آواز (گھڑے پر لگنے سے) محسوس کرتا ہے تو مارنے والے کی تلاش میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہے تو وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھا مسکرا رہا ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کی یہ شعر ثقافتی حوالے سے ایک مثالی شعر ہے جس میں گاؤں دیہات کی پوری ثقافتی خوبیاں ایک ایک لفظ سے عیاں ہوتی ہیں۔ یہاں ہندکو زبان کے مخصوص الفاظ وتراکیب کا استعمال اپنے اندر ایجاز و معانی کی وہ پرتیں رکھتا ہے جو صرف مضافاتی زندگی سے واقفیت رکھنے والے ہی جان سکتے ہیں۔ پھر کچھ کیفیات کا سامنے لانا ایک الگ حسن و خوبی کی دلیل ہے۔ چُپ چپیتا، مُش مُش کردا، یہ کیفیات کو ظاہر کرتے ہیں جب کہ 'گیٹا'، 'گھڑا' اور 'پڑ' چند ایسے الفاظ ہیں جن کا ہندکو ثقافت میں ایک خاص حوالہ ہے۔ یہ شعر نہ صرف ثقافتی حوالوں کی نمایندگی کرتا ہے بلکہ منظر نگاری کا بھی عمدہ نمونہ ہے۔ یہاں اختصار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صرف ایک شعر پر بات کی گئی ہے ورنہ جنابِ فرید کی اس غزل کا ہر ہر شعر مزید ثقافتی اقدار کا ترجمان نظر آتا ہے)۔

چھت نہ ٹہاون اُتے میرے
کندھاں کچیاں، ڈردا رہناں

اردو ترجمہ: میرے مکان کی کچی دیواریں کہیں اس کی چھت میرے اوپر گرا نہ دیں اس لیے ڈرتا رہتا ہوں۔

کھانڑیں وسطے کجھ نہینھ تھھاندا، ٹہڈ اُنہاں دے سکدے
سدا نے تُہپاں سڑدے جیہڑے نیلے بُوٹے ٹُکدے۔

اردو ترجمہ: انہیں کھانے کے لیے کچھ نہیں ملتا تو انکے پیٹ سوکھ جاتے ہیں اور وہ ہر وقت دھوپ میں جلتے رہتے ہیں جو لوگ سبز درخت کاٹ دیتے ہیں۔

کمدے نینھ فُٹ پاتھاں بہہ کے
آپڑے جن دے ٹہارے ہوندے

اردو ترجمہ: جن لوگوں کے اپنے بے شک ڈھارے ہی کیوں نہ ہوں وہ کبھی بھی فُٹ پاتھ پر بیٹھ کے سردی میں کانپتے نہیں۔

کلام فرید میں علم طبیعات:

سرسری طور پر تو پہلے بتایا جا چکا ہے کہ جنابِ فرید علم طبیعات کے معلم ہیں اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ اس علم کی تدریس میں بتا چکے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک شاعر اور وہ بھی ہندکو زبان کا (جس میں سائنسی تو کجا شعری و نثری اصطلاحات کا بھی فقدان ہے) کیسے اور کس مہارت سے علم طبیعات کو شعری پیکروں میں ڈھالتا ہے، الفاظ میں شعری لطف، حظ، اور موسیقیت پیدا کرتا ہے، اپنا مطلب چنیدہ الفاظ میں یوں بیان کر لیتا ہے کہ پڑھنے والے پر شاعری کی کیفیت بھی طاری رہتی ہے اور شاعر کے کمالِ علم و فن کی پرتیں بھی کھلتی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کے لاتعداد اشعار مذکورہ شعری مجموعوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں تاہم نمونے کے طور پر یہاں چند اشعار پیش کئی جاتے ہیں۔

لاٹاں سُنڑ فوٹان بڑائے
بچ قوآرکاں آنڑ جُڑوائے
دتے رنگ تے چارج پہچائے
ذریاں دے بچ آنڑ سجائے
سب سُنڑ مل کے پہار بنڑایا
اَپڑاں جوہڑ ناں رکھوایا
لمبے اُتے سر سڑوایا
اکھیاں بچ پروان چڑھایا

اردو ترجمہ مع تشریح: یہ دو بند جناب فرید کی ایک طویل نظم سے لیے گئے ہیں جو کی تخلیق کائنات کو سائنسی حوالوں سے بیان کرنے کے ضمن میں ہیں۔ یہ نظم چھبیس بندوں پر مشتمل ہے اور ان کی کتاب 'چھپ نماشاں' میں شامل ہے۔ اس نظم میں انہوں نے تخلیق کائنات سے پہلے اور بعد کے معاملات کو بیان کیا ہے اور خاص طور پر مادہ (Mattar) کے معرضِ وجود میں آنے کی سائنسی توجیح پیش کی ہے۔

جیسا کی مندرجہ بالا پہلے بند میں بتایا کہ سب سے پہلے لائیٹ کا ظہور ہوا جس سے فوٹان بنے، پھر یہ قوارک (Quark) میں جمع ہوئے، جن کو چارج دئے گئے اور پھر یہ ذروں (پروٹان، اور نیوٹران) کی صورت میں تیار ہوئے۔ دوسرے بند میں بتایا گیا کہ پھر ان ذروں نے مل کر ایٹم بنایا اور پھر ایٹمز حدت سے آپس میں جُڑتے گئے اور مادہ کی تخلیق کا عمل پورا ہوا۔

پروفیسر صاحب کے کلام میں اسی طرح کے اور بھی بہت سے اشعار مختلف مقامات پر کئی دوسرے طبیعاتی نظریات پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کی جنابِ فرید نے شاعری کو محض حسن و عشق، ہجر و وصال اور زلف و رخسار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میڈیم سے علم کی ترسیل اور ترویج کا کام بھی لیا ہے جو کہ ہندکو ادب میں میرے نزدیک ایک منفرد اور اچھوتا حوالہ بن کر سامنے آتا ہے۔

شعری ادب میں نئی اصناف کی ایجاد:

ادبی دنیا میں اگر کوئی کام مشکل ترین گردانا جاتا ہے تو وہ کسی بھی نئی صنف کا ایجاد کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے لیے موجد کو موجودہ اصناف کے حوالے سے باخبر بھی رہنا لازمی ہوتا ہے اور پھر نئی صنف کے سامنے

آنے اور اس کی مقبولیت کے بارے میں سوچنا بھی پڑتا ہے۔ جناب فرید اس معاملے میں بڑی گہری اور پختہ سوچ رکھتے ہیں جبھی تو انہوں نے مروجہ اصناف میں شعر کہتے کہتے تین نئی اصناف کو ہندکو ادب میں متعارف کرایا ہے۔ جن میں پہلی 'ترکے' کے نام سے انہوں نے کافی عرصہ پہلے ایجاد کی اور اپنی ایک مکمل کتاب ہی اس صنف میں شائع کروادی جس کا نام ہی انہوں نے 'ترکے' رکھا۔ (ترکے کے فنی حوالے سے بات پہلے ہی ہو چکی ہے)۔

اسی طرح انہوں نے ایک اور صنف متعارف کروائی جس کا نام 'تروپے' رکھا اور اس صنف میں بہت سا کلام اپنی کئی کتابوں میں شامل کیا۔ تروپے کا فنی حوالہ کچھ یوں ہے کہ اس کا پہلا اور تیسرا مصرع آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں جبکہ دوسرا مصرع قافیے کی بندش سے آزاد، پھر اوازان کے حوالے سے دیکھیں تو پہلا اور تیسرا مصرع تین فعلن جبکہ دوسرا مصرع چار فعلن پر مشتمل ہوتا ہے۔ اب انہوں نے ایک اور صنف کو متعارف کروانے کا اہتمام کر رکھا ہے جس کا نام ہے 'واوئی' یا 'واوینے' اس صنف میں ان کی کتاب تکمیل کے مراحل میں ہے، اس کتاب کے سامنے آنے پر اس صنف کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

کلامِ فرید کا فنی جائزہ:

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو جناب فرید کے کلام میں جملہ فنی و تیکنیکی محاسن بدرجہ اُتم موجود ہیں، انہوں نے ابتدا سے لیکر آخر تک ہندکو کی اپنی شناخت رکھنے والی بحر یعنی بحر متدارک کا استعمال اس کے تقریباً سارے اوازان میں کیا ہے۔ انہیں اس بحر کے جملہ لوازمات سے بھرپور استفادہ کی سہولت میسر ہے۔ دراصل یہ ہندی بحر ہندکو کے صوتی نظام اور الفاظ کی ہیئت اور دروبست کے حوالے سے نہایت موزوں اور مناسب بحر ہے۔ جس کے استعمال نے جنابِ فرید کے جملہ کلام میں روانی، برجستگی، تغزل، غنائیت، اور نغمگی جیسے محاسن پیدا کر رکھے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ردائف اور قوافی کے بنیادی مسائل سے بھی واقف ہیں اور ہندکو کے جاندار قافیے تلاش کرنے اور برتنے میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ بسا اوقات نہایت مشکل ردیف سے قوافی کے مختلف معنوی جہان روشن کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے کلام میں کسی طور بھی کوئی لفظ ایسا نظر نہیں آتا جو محض شعری ضرورت کے پیشِ نظر استعمال کیا گیا ہو۔ ان کے کلام کا بغور مطالعہ قاری کو بہ سہولت باور کراتا ہے کہ شاعری محض وقت گزاری یا عشق مجازی کی حد تک محدود نہیں بلکہ ایک عالم و فاضل شاعر کی شعری روش اس بات پر قادر ہے کہ شعر کی زبان کو علم کی دستک بنا کر پیش کیا جائے۔ جس دستک پر ہزاروں در وا ہو کر اسے خوش آمدید کہیں اور پھر علم کا ٹھاٹھیں مارتا دریا اپنی ارد گرد کی دنیا میں موجود بنجر قطعہ ہائے ارض کو سیراب کرتا جائے اور سوکھے پیڑوں کو ہرا بھرا کر دے جن سے علم کی نئی نئی فصلیں لہراتی نظر آئیں اور گلستانِ حیات میں پھول و پھل کی فراوانی ہو اور یوں ایک مہذب معاشرے کا وجود ممکن ہو۔

جناب فرید کے ہاں ایک اور اہم بات یہ دیکھی جا سکتی ہے کہ انہوں نے ہندکو ادب کی تقریباً ساری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور نہایت کامیابی سے کی ہے۔ ان کی کتب پر نظر ڈالیں تو حمد، نعت، غزل، نظمِ پابند، نظمِ آزاد، قطعات، ترکے، دو بیتے، تروپے، ماہیے، حرفی، اور خصوصاً ہندکو کے لوک ادب کی مایہ ناز صنف چار بیتہ اپنی عمدہ صورت میں اعلیٰ شعری محاسن کے ساتھ موجود ہیں۔ موضوعات کی بات کریں تو شاید ہی انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والا کوئی موضوع ہو جس پر ان کا قلم نہ اُٹھا ہو۔ ان کی غزل کسی بھی اردو، فارسی غزل کے سامنے رکھی اور دیکھی جا سکتی ہے۔ تخیل کی بلند پروازی، الفاظ کا عمدہ چناو اور برمحل دروبست، وارداتِ قلبی و وجدانی کا برجستہ اظہار، انسان و انسانیت کی محبت اور خیر خواہی کے جذبے سے سرشار چُست مصرعے، کائنات کی وسعتوں میں پھیلے فطرت کے حسن کی منظر کشی، جذبات کی شدت، احساسات کی حدت، مشاہدات و تجربات کا نچوڑ اور زباں و بیاں کی عمدگی، صنائع بدائع کا اعلیٰ استعمال، عمدہ تشبیہات، معروف تلمیحات، اچھوتے استعارات اور سہل ممتنع کی خوبیاں ان کی غزل کو ایک منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ اسی طرح ان کی دیگر اصناف میں موجود کلام اپنا اپنا حوالہ اور اہمیت رکھتا ہے۔ خدا لگتی کہوں تو یہ مضمون ان کی مجموعی ادبی خدمات اور حیثیت کا احاطہ کرنے کی لیے کافی نہیں۔ ان کی مذکورہ آٹھ کتابوں اور دیگر خدمات پر تو ایک پورا تھیسس لکھنا بنتا ہے مگر اس کام کیلیے وقت چاہیے۔

آخر میں ان کی نثری کاوشوں کی بات کی جائے تو ہمیں جناب فرید ایک منجھے ہوئے نثر نگار کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ ان کے افسانوں اور دیگر نثری کاموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانوں میں گہرا سماجی شعور اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں اور رشتوں کی اہمیت اور قدر و منزلت سے آگاہی ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ انسانی زندگی اور اپنی مٹی سے جُڑے ہوتے ہیں، چلتے پھرتے کردار، کہانی مربوط اور معنی خیز جملوں سے مزین، کہانی کا فطری انجام کو پہنچ کر نتیجہ قارئین پر چھوڑتے ہوئے ایک خوبصورت موڑ پر ختم ہونا ان کو اس صنف میں بھی ایک اونچا مقام اور ادبی وقار بخشتا ہے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ پروفیسر محمد فرید کا قلم ایک لمبے عرصے تک اپنی پوری رفتار سے چلتا رہے، چلتا رہے اور چلتا ہی رہے۔ آمین۔

✦✦✦

آنکھیں، یقیں، چراغ از احمد ریاض

ڈاکٹر عادل سعید قریشی

دو چار اہلِ دل کہ طبیعت شناس ہیں
ورنہ رہا کہاں ہے کوئی شخص کام کا

احمد ریاض، ایک زرخیز شاعر ہے، جو بیک وقت اردو اور ہندکو میں تمام کی تمام اصناف میں محوِ سخن سرا ہے۔ شاعری کو وہ کوئی مقدس گائے نہیں قرار دیتا آئے روز وہ ایک نئے تجربے اور تازہ کاریوں کے ساتھ سامنے آرہا ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ شعر ایک فن ہے اور فن کار سے اخلاص، توجہ اور تجربے کا تقاضا کرتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے بھی کہیں لکھا تھا کہ شعر اور زندگی کا ربط شاعری کی اصل متاع ہے۔ کولرج اسی شعر کی خوبی کو ارفعیت اور پیش کش کی سنجیدگی سے معنون کرتا ہے۔ خواجہ حالؔی نے اس خوبی کو شاعری کو مغز قرار دیا ہے، احمد ریاض کی شاعری اس کے موضوعی تجربے کے معروض بننے، خیال کے ترفع کو پیشکش کی رفعت میں ڈھلنے اور لفظیات کی متانت سے ظہور میں آنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ احمد کے پاس وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جن کو لے کر وہ اپنی اردو شاعری کو اردو کی کلاسیکی اور رومانوی شعر روایت کے ساتھ جوڑ دیتا ہے، مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جس شاعری سوتے کو وؔلی، مومؔن اور غالؔب نے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے احمد ریاض بھی اس چشمہ سے سیراب ہونے والا شاعر ہے۔ ''آنکھیں، یقیں، چراغ'' کے مکمل اور تفصیلی مطالعہ کے بعد مجھے یوں لگا کہ احمد ریاض اردو کے خوش فکر شاعر مصحفی گونڈوی کا شاگردِ معنوی ہے۔ اس کے پاس خیال کی فراوانی، برت کی ندرتا، صنائع بدائع کی خوش سلیقگی اور بیان کی سادہ مصحفی کی یاد دلاتی ہے۔ کتاب ''آنکھیں، یقیں، چراغ'' میں ستانوے غزلیں اور چھ نظمیں اور نو فردیات شامل ہیں۔ احمد ریاض کی شاعری کا سرسری مطالعہ اس کی شاعری کے تین پہلوؤں کو ظاہر کرتا ہے:

ا۔ موضوعات کی ندرت

۲۔ کلاسیک مزاج

ج۔ لفظیات کی ثروت مندی

موضوعات کا جہاں تک تعلق ہے تو احمد ریاض کا ذہنِ رسا ہر شعر میں داد خواہ ہے، اس کا زندگی اور دنیا کو دیکھنے کا انداز اس قدر عمیق اور گہرائی رکھتا ہے کہ انسان کو ایک خوش گوار حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی ذہانت اور مشاہدے کی داد دیئے بنا بات بنتی نہیں۔ وہ نہایت زیرک اور ماہر فن کار ہے جو اپنے خیالات اور موضوعات کو ایک کڑے پیمانے پر پرکھتا ہے اور پھر ان کو وہ اپنے فن کی کسوٹی پر کستا جاتا ہے، اس کی معیار کی بالیدگی خود بھی اس کی شاعری کی متانت کی ضمانت ہے:

محبت سے مرے اندر سلیقہ آگیا
مجھے بات کرنے کا طریقہ آگیا

دانے دانے پر جو گرتے تو نسب گرتا تھا
ورنہ مشکل تو نہ تھا نام کما سکتے تھے

جلوہ عکسِ تبسم کی جھلک پانے کو
حجرہ ذات کو معکوس کیا ہے اس نے

کتنے حسیں لوگ تھے پل بھر میں کھو گئے
یونہی بس اک خیال سے گھبرا گیا ہوں میں

احمد ریاض کے ہاں ملنے والے موضوعات کا تعلق زندگی سے ہے، ''آنکھیں، یقیں، چراغ'' میں ہمیں معاشرتی، سماجی، نفسیاتی، معاشی مسائل کے علاوہ فرد کی فکری الجھنیں، تمدنی مسائل، ثقافتی بدلاو کے اثرات، اقدار کی شکست کے نوحے، دم توڑتی روایت کے مرثیے، اجداد کی تہذیبی وراثت کے لٹنے اور لٹانے کا غم، ماضی سے حب، حال سے لگن اور مستقبل کی فکر، انفرادی اور اجتماعی گراوٹ پر زاری، غرض یہ سب اس کے موضوعات ہیں لیکن وہ ان موضوعات کو ایک منجھے ہوئے شاعر کی طرح اپنے شعر میں سموتا جاتا ہے، وہ اپنے فن شعر کو زک نہیں پہنچاتا۔ اس کا شعری ذوق اور اس کی ناقدانہ بصیرت اس کی شعری جمالیات کو نقصان نہیں پہنچانے دیتی۔ وہ ایک بالغ شاعر کی طرح اپنے موضوعات کو اپنے مشاہدات اور فہم اور شعری آنچ پر رکھتا، پرکھتا، جانچتا اور ڈھالتا جاتا ہے، تب کہیں جا کر اس کا ایک شعر مثالی لفظیات کے دروبست کے ساتھ قرطاس پر رونما ہوتا ہے:

عشق تھا، کچا گھڑا تھا، سوچے نا
کون دریا پار ہونا چاہیے تھا

زندگی کو، زندگی میں، زندگی سے
اس قدر بے زار ہونا چاہیے تھا؟

کل یہی دیپ اندھیرے میں کہیں لو دیں گے
آج ورثے میں جو بچوں کو پڑھائی دے گا

من و سلویٰ نہیں اترا مرے لوگو! ہم پر
ہم کو یہ خاک سجانے میں بڑی دیر لگی

احمد ریاض کا مسئلہ بھی وہی ہے کہ وہ بھی بیسویں صدی کا انسان ہے جس نے ان لوگوں میں آنکھ کھولی جو روایات اور اقدار کی پگ پہنا کرتے تھے۔ وہ سن کہ جس نے دین کو متاع اور ریتی، رواج کو متاعِ زیست جان کر زندگی گزاری۔ وہ انسان کہ جس کے

ریڑھ کی ہڈی سے چپکے ہوئے پیٹ کا ثمر سیر چشمی تھی۔ احمد ریاض کے اس عہدِ زریں میں انسان ایڑیاں اٹھائے بغیر قد آور ہوتا تھا۔ اس نے اپنی جوانی کی ہر ریت اور رسم کو اپنے لڑکپن کے وقت کے ساتھ موازنے کر کے دیکھا ہے، وہ ماضی پرست نہیں ماضی کا محب ہے، لیکن اس کا کیا کیجیے کہ جس جس نے بیسویں صدی کی آخری دھائی دیکھی ہے وہ آج کی سماجی اور معاشرتی شکست و ریخت سے دل برداشتہ ہے، وہ میں بھی ہوں اور احمد ریاض بھی ہے:

کسی شام آ کے سن مری شاعری
مرا درد مری زبان سے مرے دوستا!
قدیمی جنگل کے اس طرف بھی یہی خبر تھی
پرانے وقتوں کا لکڑہارا نہیں رہے گا
ڈھلتے ہوئے سائے کی رفاقت بھی سہی ہے
گرتی ہوئی قدروں کو سنبھالے بھی دیے ہیں
ایک بوڑھے نے روتے ہوئے یوں کہا
اب چلاتا نہیں کوئی ہل جانیا!
ہر دہلیز بانٹی جا چکی ہے
میں اپنے گھر کو آدھا کر رہا ہوں

احمد ریاض کی شاعری، نری شاعری نہیں اس کے پاس ایک فکر اور ایک سوچ موجود ہے۔ احمد شاعری کے منصب پر ایمان رکھنے والا شاعر ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کی شاعری، اس کے لفظ ہی اس کی کل قوت اور طاقت ہیں۔ وہ شاعری کو اظہارِ خیال اور ترسیل فکر کا آلہ جانتا ہے۔ اس کے لیے شعر برائے شعر اس فن اور اس ودیعت کی بے توقیری ہے۔ وہ زندگی کو شعر سے برتا ہے۔ یہی مسلک اردو شعرا کی اکثریت کا ہے لیکن وہ اکثریت سے اپنی فکر کی ندرتا کے بعد اپنے کلاسیکی مزاج کے سبب ممتاز ہو جاتا ہے۔ کلاسیکی مزاج کی آپ جس تعریف کو جامع مانتے ہیں، میں بھی اسی تعریف کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ اساتذہ فن کے قائم کردہ اصولوں اور اسالیب کے ساتھ اس خاص زبان و ادب کی روایت کی پاسداری ہو۔ احمد ریاض کے ہاں یہ کلاسیکی طرز ملتا ہے اور اس نے اردو غزل کے ڈھانچے کو اساتذہ فن کی کامل پیروی میں برتا ہے اور یوں اس کا انفرادا اس کی غزل کے حسن اور تاثیر کو دو آتشہ کر رہا ہے۔ احمد ریاض کے ہاں شعری اپنے فطری سبھاو اور پیشکش کی کلاسیکیت کے عمدہ نمونے کی صورت ملتے ہیں:

دل گرفتہ ہوں میں احساس کا مارا ہوں
آپ ایسا نہ سمجھنا کہ میں ہارا ہوا ہوں
زندگی موت کے دامن سے لپٹ جاتی ہے
خوف انسان میں آتا ہے نکل جاتا ہے
سب تری محبتوں کے سکھ مجھے
سب ترا ملال ہے، کمال ہے
یہ خوشبو چھپ نہیں سکتی ذرا اس بات کو سوچو
کوئی تو بات کی ہوگی کبھی دالان میں ہم نے

لفظیات، ہی وہ سطح ہے جہاں ایک شاعر دوسرے ہر شاعر سے اپنا انفراد منواتا ہے۔ احمد ریاض جس طرح اپنے ڈکشن کو لے کر سامنے آتا ہے قاری کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شاعر رعنا کس قدر خود کفیل اور با ذوق ہے، اس کے اشعار میں الفاظ کا فطری بہاو اور برتاو اس کے اشعار کو بلاشبہ حسن اور تاثیر سے مالامال کر دیتا ہے۔ احمد ریاض کی شعر قوت کا حقیقی انحصار اس کے اسی وصف پر ہے کہ وہ لفظیات کی ثروت مندی کے ساتھ میدان شعر میں اترا ہے۔ الفاظ کی کامل چناو اور لغت فہمی اس کے اشعار کو معنویت کو بلند درجوں پر لے جاتی ہے۔ اس کے ہاں موضوعات کی فراوانی اور کلاسیکی مزاج کو بڑھاوا دینے اور اس سطح کو برقرار رکھنے کے ہزار اور وسیلوں کے علاوہ ایک مستند اور معتبر وسیلہ لفظیات ہیں۔ لفظیات کے باب میں اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مطالعہ ہی وہ وصف خاص ہے جو کسی بھی تخلیق کار کو اس منتہا تک پہنچا سکتا ہے جو کسی بھی تخلیق کار کی منشا ہوتی ہے۔

''آنکھیں، یقیں، چراغ'' کا بالاستیعاب مطالعے سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ احمد ریاض نے اپنی شاعری میں اپنے عہد، اپنے زمانی مسائل، شعری وسیلوں، مافی الضمیر کو شعری سانچوں میں نہایت معروضیت سے پیش کیا۔ اس کا تصورِ فنِ شعر جو بھی ہو لیکن اس کے ہاں اس کے اپنے قاری کے لیے بہت کچھ ہے اور وہ اپنی کتاب کے مطالعے میں اپنے قاری کو آزاد اور مطمئن چھوڑتا ہے۔ اس کا قاری اس کے شعری سفر میں بڑی سہولت سے اس کے خیالوں کی وادیوں میں گھومتا اور اپنی مرضی کے پھول چنتا جاتا ہے۔ ''آنکھیں، یقیں، چراغ'' ہزارہ کی ادبی روایت کا ایک معتبر حوالہ تو ہے ہی یہ کتاب اردو ادب کے قومی سطح کی روایت کا بھی ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔

نواحِ یار کے تازہ کسی امکان میں ہم نے
پرانے خواب رکھے ہیں نئے سامان میں ہم نے

❀❀❀

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
غالب

اُردو غزل اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں

لبنیٰ صفدر/ لاہور

(گزشتہ سے پیوستہ)

مومن خاں مومن (۱۸۵۲-۱۸۰۰) اُردو شاعری کی تاریخ میں مومن ایک نہایت باکمال شاعر کی حیثیت سے موجود ہیں۔ عہدِ مومن میں دلی کے ادبی ماحول اور لال قلعے پر ذوق کا مکمل قبضہ تھا۔ اپنی تمام تر اعلیٰ شاعری کے باوجود مومن کی وہ قدر اور عزت افزائی اُس وقت نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس پر وہ نالاں بھی رہے۔ مومن کی شاعری عشقیہ مضامین اور تصوف کے مضامین سے آراستہ ہے۔ مومن کا عشق ایک انسان سے دوسرے انسان سے عشق ہے۔

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
(مومن)

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے
(مومن)

کائنات اور انسان مومن کو ایک بھید کی صورت نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

''مومن نے اپنے فن کی دنیا کو اسراریت سے آشنا کیا۔ اُس کی شاعری عمر بھر معنی کی مخفی سطحوں کا اظہار کرتی رہی اور وہ قاری کو ان اسرار و رموز کی تہیں کھولنے کے لیے دعوت دیتا رہا۔''(۵۹)

مومن کی غزل کو جس تخلیقی قوت نے ادبی حوالے سے معتبر کیا وہ اُن کی غزل کا کلاسیکی انداز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کے کلام میں بے شمار اشعار ایسے ملتے ہیں جو زبان زدِ عام ہیں اور سہل ممتنع کے علاوہ مثال ہیں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

گزشتہ پون صدی میں مومن کی شاعری تنقیدِ شعر کی کڑی منزلوں سے گزری ہے۔ ان کے شعری مرتبے کا اقرار اور انکار کرنے والے دو انتہاؤں پر نظر آتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر (۱۸۶۲ء-۱۷۷۵ء) دلی کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے مغلوں کی گہنائی ہوئی عظمت کے سائے میں اپنی زندگی بسر کی۔ کمپنی کے دیے ہوئے وظیفے پر ماہ و سال گزرے۔ ظفر کی شاعری نے اٹھارویں صدی کے آخری برسوں میں آنکھ کھولی۔ ایک طویل عرصے تک ظفر کی شاعری ذوق کے اثر سے گہنائی رہی۔ بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری:

''ظفر کی انفرادیت کو دیکھنے کے لیے اس کی شعری ذات کو تلاش کیجیے جو خالصتاً اس کی اپنی ہے۔ اس منفرد شعری ذات کا ذوق کی عطا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ظفر کی شعری ذات میں تنہائی، اُداسی اور یاسیت کی ایک رُت چھائی ہوئی ہے۔ ذوق اس رُت کے طرزِ احساس ہی سے محروم ہے۔ جب کہ یہی طرزِ احساس ظفر کی کلیدی شناخت بن چکا ہے۔''(۶۰)

ظفر کی شعری ذات کے جائزہ کے لیے اس کی ایک مشہور غزل کے چند اشعار بطور نمونہ:

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے
کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر
ایسی بستی کو تو ویرانہ بنایا ہوتا

اظہارِ ذات کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ ظفر کے کلام میں ملتا ہے۔ ظفر کی شاعری فرد سے بڑھ کر اجتماعی زندگی کے المیہ کو بھی بیان کرتی ہے۔

ظفر احوالِ عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

ظفر کی وفات کے آس پاس دلی کی درماندہ ادبی بساط پر سکوت طاری تھا۔ غالب، ذوق، مومن، شیفتہ اور ظفر جیسے شعرا کا دور ختم ہو چکا تھا۔

مصطفےٰ خاں شیفتہ (۱۸۶۹ء-۱۸۰۹ء) شیفتہ ۱۸۰۹ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ شیفتہ کی تخلیقی زندگی کا بھرپور دور ۱۸۲۲ء سے ۱۸۳۶ء تک ہے۔ شیفتہ نے کلاسیکی مزاج اور تہذیبی اقدار کے اثرات سے اپنا رنگِ سخن پیدا کیا۔ شیفتہ روایت سے گہری قربت رکھنے والے شاعر ہیں۔ شیفتہ کی شناخت اُن کی اُن غزلوں میں ہے:

کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں
کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں
کچھ زہر اُگل رہی ہے بلبل
کچھ زہر ملا ہوا ہے مے میں

شیفتہ کے عہد تک غزل کی ثقافت اپنی روایات، رسوم اور آداب سے پوری طرح آباد تھی۔ مولانا حسرت موہانی شیفتہ کے شعری مقام کے بارے لکھتے ہیں:

''شعرائے دلی کے قدیم انداز کی کیفیتیں جیسی ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں ویسے اُن کے معاصرین میں کسی کو نصیب نہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس باکمال کے ساتھ دہلی کے قدیم طرزِ سخن کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ یعنی کہ شیفتہ کے بعد بہ استثنائے چند اہلِ دلی سے وہ علوم و فنون کا چرچا جاتا رہا۔''(۶۱)

گرد کلفت، خاکِ صحرا، دشنۂ غم، نوکِ خار
تیرے وحشی کے لیے ایسا بیاباں چاہیے
(شیفتہ)

شیفتہ کے ساتھ ہی دبستان دلّی کا کلاسیکی مزاج بھی رُخصت ہوا جو میر وسودا، درد، غالب اور مومن کی روایات سے عبارت تھا۔

ہیں آنے والے شیفتہ کچھ اور دوست بھی
مطرب کو حکم ہو کہ ابھی نغمہ گر نہ ہو

نواب مرزا خان داغ دہلوی (۱۹۰۵ء-۱۸۳۱ء) نے گیارہ برس کی عمر میں ذوق کی شاگردی اختیار کی۔ داغ کی تربیت لال قلعے میں ہوئی۔ داغ کی پہچان ان کا لب ولہجہ اور ان کی زبان ہے۔ داغ کی غزل قدیم طرز کی غزل کا نمونہ ہے۔ مگر شوخی، شرارت اور شگفتگی اُن کی غزل کو تازہ اور منفرد بناتی ہے۔

دی موذن نے اذاں وصل کی شب
ہائے کم بخت کو کس وقت خدا یاد آیا
(داغ)

داغ کی غزل کی شوخی اور بانکپن کو زیادہ پذیرائی ملی۔ اُن کی غزل سے قاری مکمل طور پر حظ اُٹھاتا ہے۔ داغ کی شاعری میں اپنے دور کے عکس بھی ملتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''داغ بنیادی طور پر غزل کے شاعر اور زوال آمادہ معاشرے کے نمائندہ تھے۔ انہوں نے سیدھے سادے جذبات اور حواس کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اس سے بوالہوسی اور لذت پسندی کا انداز پیدا ہوا اور بازاری طوائف غزل میں محبوب کے طور پر اُبھر آئی۔'' (۶۲)

داغ کی زندگی میں عیش وعشرت میں گزری داغ کے رنگ میں غزل کہنا اُن کے ہم عصر شعرا کے لیے آسان نہیں تھا۔ اگر انہوں نے اس کی حتی المقدور کوشش کی۔

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تیری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی
(داغ)

ہم نے اُن کے سامنے پہلے تو خنجر رکھ دیا
پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا، سر رکھ دیا
(داغ)

بیسویں صدی میں داغ کی غزل نے لوگوں کو بھرپور تسکین دی۔

امیر مینائی (۱۹۰۰ء) امیر مینائی کا تعلق صوفی گھرانے سے تھا۔ ان کے کلام میں اخلاقیات سے متعلق مضامین ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ غزل کے موضوعات کی امیر مینائی نے جذباتی اور حسی زاویوں سے پیش کیا۔ اظہارِ عشق میں تہذیبی وقار برقرار رکھا۔

خنجر چلیں کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
(امیر مینائی)

امیر مینائی ناسخ کے مقلد تھے اور انہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ دوسری طرف داغ کے حریف تھے۔ علمی لحاظ سے داغ سے برتر تھے۔ مگر بعد میں اُن کے انداز کی پیروی کی۔

گل ہوا غنچہ تو آواز یہ اُس سے آئی
جمع پھر دل نہیں ہوتا ہے پریشاں ہو کر

امیر مینائی کا المیہ یہ تھا کہ انہیں اپنے عہد میں داغ کے مذاقِ غزل کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے اُن کی فنی خوبیوں کے بہت سے روشن پہلو دب گئے۔

یہ شاخِ گل ہی اونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

امیر مینائی نے تشبیہ اور استعارے کا استعمال کمال خوبی سے کیا ہے۔ ان کی زبان بڑی نکھری اور بجی ہوئی ہے۔

جلال لکھنوی (م ۱۹۱۱ء) لکھنؤ میں پرورش ہوئی۔ لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کو بچپن سے ہی قریب سے دیکھا اور پرنشاط زندگی کا نظارہ کیا۔ زوال لکھنؤ کے بعد والد کے ساتھ رام پور آ گئے۔ مگر کچھ عرصہ بعد ہی واپس لکھنؤ آ گئے۔ جلال اپنے اسلوب کے باکمال شاعر تھے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

''جلال کی شاعری لکھنوی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ ان کی مضمون آفرینی نے غزل کو اس عہد کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا۔'' (۶۳)

جلال باغِ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا

....

اک قدم جانا جنہیں دشوار تھا
شوق لے کر سینکڑوں منزل گیا

امیر اللہ تسلیم (۱۹۱۱ء) مضمون نگاری سے اُن کی غزل بجی ہوئی ہے۔ جذبے اور احساسات کے شاعر ہیں۔ محاسن شعر کو اُستادانہ شان سے برتا اور غزل کو فنی خوبیوں سے نکھارا ہے۔

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اُٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

....

تنگی کنج قفس، رنج اسیری، داغ گل
اتنے سامانِ ستم اور ایک جانِ عندلیب

مولانا الطاف حسین حالی (۱۹۱۴ء-۱۸۳۷ء) جدید غزل کی ابتدا مولانا حالی کے مقدمہ شعر وشاعری سے ہوتی ہے۔ حالی نے غزل کی اصلاح سے متعلق نمایاں کام کیا۔ حالی کا مقدمہ ۱۸۹۳ء میں اُن کے دیوان کے ساتھ شائع ہوا۔ انہوں نے صرف حسن و عشق کی شاعری کو رد کر دیا۔ اس کے ساتھ انہوں نے قومی، مذہبی، اخلاقی شاعری پر زور دیا۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اُردو غزل میں معنوی تسلسل پیدا کرنے میں حالی کا بڑا کام ہے۔ حالی نے مذہب اور اخلاق کے نقوش اُبھارنے میں اُن رنگوں سے کام لیا جس سے اب تک غزل گو شعراء محبوب کے خدوخال کی آرائش کرتے آئے تھے۔

شاعری

نہیں نہیں ترے وعدے پہ اعتبار ابھی
ٹھہر بھی جا مری آنکھیں ہیں اشکبار ابھی
ابھی تو پھولوں کے کھلنے کی رُت نہیں آئی
اَٹی ہوئی ہے بگولوں سے شاخسار ابھی
ابھی تو شام گلے مل رہی ہے ظلمت سے
نہیں ہے صبح کے تارے کو اختیار ابھی
محبتوں کے مسائل سلجھ تو سکتے ہیں
فضا نہیں ہے زمانے کی سازگار ابھی
گلہ کریں بھی تو کس سے تری جدائی کا
کہ جاگتی ہے صدا بن کے شعلہ بار ابھی
یہ ریگ زار کی مانند خشک کیسے ہوں
کھلے ہوئے ہیں مرے زخم بے شمار ابھی
چراغِ جاں سے اُجالا کیا ہے راہوں میں
کہاں ملے گا غموں سے مجھے قرار ابھی
یہ اور بات کہ مدت ہوئی تجھے بچھڑے
مہک رہا ہے تری یاد کا خمار ابھی
دعائیں مانگتے لمحوں نے یہ پیام دیا
خزاں کے ہاتھ میں ہے دامنِ بہار ابھی
کٹی ہے فرقت و ہجراں میں زندگی میری
وہ لوٹ آئے گا مجھ کو ہے انتظار ابھی
یہ اور بات ابھی تک ہے تازہ دم بسمل
اگرچہ حدِ نظر تک ہے ریگزار ابھی

بسمل صابری/ ساہیوال

کہاں دِل میں رمق تحریص جیسی!
صفت اُس میں ہے اِک تقدیس جیسی
کوئی ناصح اِدھر سو بار آئے
مگر صورت نہ ہو ابلیس جیسی!
کمال ایسا ہے نقادانِ فن کا
ہوئی تنقید بھی تنقیص جیسی
مرے بس میں نہیں اب میرا رکنا
کشش اُس میں ہے مقناطیس جیسی
وہ سب سے منفرد، سب سے الگ ہے
نہیں دو چار، یا دس بیس جیسی
بیانِ حسنِ جاناں، تیرے قرباں!
تری تفصیل بھی تلخیص جیسی!
کھلا یہ عرصۂ ہجراں میں مجھ پر
لگے ہر سانس ہی اک ٹیس جیسی
پری ہے اپسرا ہے، جانے کیا ہے
مگر ہے حُسن میں بلقیس جیسی
تلاوت اس کے چہرے کی ہے، گویا
نصاب عشق کی تدریس جیسی
یہی بہتر تھا مرنے دیتے مجھ کو !
مسیحاؤں نے کی تشخیص جیسی

نسیم سحر/ راولپنڈی

عکس تو جس کا ہے

زندگی جھیل تو لی اپنے طریقے سے مگر
راہ میں کتنے قدم ٹھیک پڑے کتنے غلط
اُتنی بہتان تراشی بھی نہ کافی تھی انہیں
خیر خواہوں کو نظر آئے تھے ہم جتنے غلط

ہاتھ اور ذہن ہمارے تھے سلامت لیکن
دور و نزدیک کہیں کوئی خریدار نہ تھا
اپنی مجبوری کے ہاتھوں رہے بدحال بہت
پھر بھی بے چارگیٔ غم سے سروکار نہ تھا

کوئی تخصیص تھی اپنوں کی نہ بے گانوں کی
سب کو بس فکر تھی اُن کا نہ نشانہ چوکے
زیست ہر شخص کی کب قیمتی ہوتی ہے یہاں
ادھ موا بن کے پھرا اچھا ہے لہو وہ تھوکے

اس قدر رنگ بدلتے ہوئے دیکھا ہے تجھے
تو نہیں اب تو یہ لگتا ہے تماشا ہم ہیں
تو جو دنیا ہے وہ آپ اپنی ہی زندانی ہے
عکس تو جس کا ہے دراصل وہ دنیا ہم ہیں

شاہین/ کینیڈا

اندیشے

یوں ہی اک شب فسردہ و مغموم
ایک کہنہ درخت کے نیچے
ہم ستاروں کی چھاؤں میں گم سم
اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے
سونی سونی اُداس نظروں سے
بے خیالی میں ایک دوسرے کو
یاس و حسرت سے تکتے جاتے تھے
آنے والے دنوں کے اندیشے
دل کو بے وجہ کر رہے تھے ملول
فرطِ جذبات سے چھلک آئے
چند آنسو کہ ان کو کیا کہیے
کتنے انمول تھے مقدس تھے
ہم نے کتنے خلوص و چاہت سے
اشک اک دوسرے کے پونچھے تھے
خود کو جھوٹی تسلیاں دی تھیں
چلے تو صورتِ طوفاں رُکے تو مثلِ غبار
ہمارے لوگ اصولِ سفر نہ پہچانے
نہ مٹ سکی ہی محبت نہ بھر سکے ہی وہ زخم
بدل سکے ہیں ذرا بھی نہ تیرے دیوانے

ہمیں تھے ایسے پلٹ کر نہ آ سکے آزر
وگرنہ دور تک آیا تھا کوئی سمجھانے

شمیم آزر/امریکا

خیمہ ہست اُٹھاتے ہیں، لگا بیٹھتے ہیں
ہم کبھی دھوپ، کبھی سائے میں آ بیٹھتے ہیں
ہم فلک زاد ستاروں کی طرح گزریں گے
تیری دنیا کے تھڑے پر تو گدا بیٹھتے ہیں
کیفیت، قطع تعلق کی بدل جاتی ہے
پھر اسی خواب سے ہم آنکھ لڑا بیٹھتے ہیں
خود کو قالین کی صورت، میں بچھاتا ہوں ادھر
تو بدن تان کے اک چھتری بنا، بیٹھتے ہیں
تیرے عہدے کو نہیں، ملنے تجھے آئے ہیں
اُٹھ کے دروازے پہ آ، ہاتھ ملا، بیٹھتے ہیں
یہ بدن کانچ کا گرتے میں سنبھل جاتا ہے
تھوڑی مہلت سے بڑی آس لگا بیٹھتے ہیں
جمع کرتے ہیں بہت ہجرِ غزل کے ریزے
شعر بنتا نہیں اور پونجی گنوا بیٹھتے ہیں

قیوم طاہر/اسلام آباد

موجۂ دل تو رہا میری روانی سے الگ
میں یونہی کرتا رہا پانی کو پانی سے الگ
اصل کردار نبھا کر میں دکھاؤں گا اُسے
جس نے اک عمر رکھا مجھ کو کہانی سے الگ
دن بھی اک کارِ اذیت کا سیاپا کرتے
ہو کے بیٹھا ہوں کسی شام سہانی سے الگ
تم تو غیروں کے مفادات لیے پھرتے ہو
تم سے کیا ہوگی کوئی بات پرانی سے الگ
روشنی نیل نہائی ہوئی یادوں کی رہی
خوشبوئے ہجر ہوئی رات کی رانی سے الگ

قیوم طاہر/اسلام آباد

خوشبوؤں، گلابوں نے تتلیوں نے ہجرت کی
جب گیا وہ گلشن سے گل رُتوں نے ہجرت کی
بجھ گئے اُجالے سب روشنی کے ہالے سب
کر کے شب سے سمجھوتے سورجوں نے ہجرت کی
وحشتوں کے منتظر ہیں سارے کھیت بنجر ہیں
جب سے میری بستی سے بادلوں نے ہجرت کی
وہ جدا ہوا تو پھر کیسے زندگی کرتے
دل سے زندگانی کے ولولوں نے ہجرت کی
اس کے اِذن سے ہی دل سینے میں دھڑکتا تھا
حکم جب ملا اس کا دھڑکنوں نے ہجرت کی
اُجڑے اُجڑے گلشن میں شور تھا بپا ہر سو
جب کٹے درختوں سے پنچھیوں نے ہجرت کی
اس قدر نہ تھا آساں چھوڑنا ترے در کا
کیا بتائیں کس دل سے غم زدوں نے ہجرت کی
کتنے ضبط سے اس کو پہلے کر دیا رُخصت
پھر چھلکتی آنکھوں سے آنسوؤں نے ہجرت کی
پہلے میری آنکھوں سے دور دور سپنے تھے
جب وہ آیا خوابوں میں رتجگوں نے ہجرت کی
شب گزیدہ رستے ہیں منزلیں بھٹکتی ہیں
جب جلیلؔ راہوں سے جگنوؤں نے ہجرت کی

احمد جلیل/اوکاڑہ

جنوں کو آزمانے جا رہا ہوں
تجھے تجھ سے چرانے جا رہا ہوں
مٹائے گا وہی تاریکیوں کو
دیا جو میں جلانے جا رہا ہوں
وہ جن کا خون پانی ہو گیا ہے
وہی رشتے نبھانے جا رہا ہوں
محبت کے تقاضے بھی عجب ہیں
تجھے پا کر گنوانے جا رہا ہوں
وفا کے آسرے پر بے وفا سے
کیے وعدے نبھانے جا رہا ہوں
خزاں زادو چلو ہمراہ میرے
کہ صحرا کو کھلانے جا رہا ہوں
جو نفرت کو جلا دیتی ہے شاہد
میں وہ آتش بجھانے جا رہا ہوں

ہمایوں پرویز شاہد/لاہور

بھنور میں فکر یہی تھی کہ ناؤ پار لگے
پر اب یہ خالی کنارہ خدا کی مار لگے
جہاں میں اور اذیت کہاں ملے ایسی
کہ کام کرنا پڑے وہ جو ناگوار لگے
یہ شہر سارا ہی مقتل یہ لوگ سارے قتیل
یہاں پہ جبر کے خنجر کو روز دھار لگے
وہ اس کے ہاتھ میں دیتا ہے کیوں کسی کا نصیب
جسے غریب کا لقمہ بھی بے شمار لگے
اے کاش نکتہ چیں میرے کبھی ہو ایسا بھی
تجھے بھی درد ملے درد کا خمار لگے
خدا کرے کہ تری رات جاگ کر گزرے
خدا کرے کہ تجھے میرا انتظار لگے
ہمارا واسطہ کچھ ایسے دوستوں سے رہا
حریف محفلوں میں خلوتوں میں یار لگے
یہ راہ اہلِ جنوں ہے ذرا سنبھل کے یہاں
قدم ہو یار کی جانب تو سوئے دار لگے

نیازت علی نیاز/لاہور

ٹھنڈی یخ ہوا اور بارش
مستی بھری فضا اور بارش
کالی اندھی رات اور میں
میرے ساتھ خدا اور بارش
سب کچھ میرے دل کو بھائے
کالی زُلف گھٹا اور بارش
دونوں اچھی لگتی ہیں
دل کو تیری وفا اور بارش

چسکی چسکی لے کر سمجھا
چائے میں مزہ اور بارش
اس کی یاد کی شال کو اوڑھے
بیٹھا ہوں تنہا اور بارش
دیکھو کب تک چلتی ہے
اس کی یہ انا اور بارش
آج تو دیکھنے والی ہے
اس کی شوخ ادا اور بارش
کرسی میز سجا کے ناز
دیکھو اس کی راہ اور بارش

وحید ناز/لاہور

آنچل میں اپنے چاند ستارے لپیٹ کر
جی چاہتا ہے اوڑھ لوں سارے لپیٹ کر
محفل میں آج سب سے بچا کے نظر مجھے
بھیجے ہیں اس نے شوخ اشارے لپیٹ کر
بے ربط زندگی کو بھی ترتیب مل گئی
گیسو جو میں نے آج سنوارے لپیٹ کر
ان میں علاج درد ہے دل کا قرار ہے
رکھے ہیں چارہ گر نے جو چارے لپیٹ کر
کمرے کے ایک مہیب سے کونے میں آج بھی
رکھے ہیں میں نے درد تمہارے لپیٹ کر
عنبر مجھے گرا کے محبت کے بحر میں
یہ کون لے گیا ہے کنارے لپیٹ کر

فرحانہ عنبر/گوجرانوالہ

اُلجھنوں سے نجات کیسے ہو
دل سے دل تک کی بات کیسے ہو
جب مقدر میں نارسائی ہے
تیرے ہاتوں میں ہات کیسے ہو
ساری دنیا سے جیت سکتا ہوں
تیری یادوں کو مات کیسے ہو
تو ہی جب اُٹھ گیا ہے محفل سے
انجمن میری ذات کیسے ہو
تو نے ڈالی سے جس کو توڑ دیا
پھر ہرا اب وہ پات کیسے ہو

عامر بن علی/جاپان

درمیاں پردہ نہ پھر کوئی بھی حائل رکھا
اس طرح چاہا اُسے خون میں شامل رکھا
اک اشارہ تھا کسی آنکھ کے رستے جیسا
ایک چہرہ تھا جسے حاصلِ منزل رکھا
جب جواں ہونے لگی پاؤں کو زنجیر کیا
نام جس لڑکی کا ماں باپ نے پائل رکھا
اُس نے کشکول میرے ہاتھ کو بننے نہ دیا
ایک در کا میرے رب نے مجھے سائل رکھا
ایک ہی خواب دریچہ تھا جہاں پر لبنٰی
اپنی آنکھیں بھی وہیں رکھیں، وہیں دل رکھا

لبنٰی صفدر/لاہور

چلتے چلتے گہرے پانی میں اُتر جاتا ہوں میں
روکتا رہتا ہے کوئی اور مر جاتا ہوں میں
پھول بن کر کھلتا ہوں نادیدہ خطے میں کہیں
اور کسی انجان رستے میں بکھر جاتا ہوں میں
چاند اُترا رہتا ہے مجھ پر کبوتر کی طرح
کہکشاؤں سے گزرتا اپنے گھر جاتا ہوں میں
اجنبی دیسوں میں دونوں ملتے ہیں صدیوں کے بعد
ہاتھ اُس کا تھام کر جانے کدھر جاتا ہوں میں
میں نے پانی پر بنا رکھی ہیں تصویریں بہت
پھول جب تالاب میں گرتا ہے ڈر جاتا ہوں میں
کتنا ہوتا ہے سہانا اُس کی آنکھوں کا سفر
کیسے کیسے دشت و دریا پار کر جاتا ہوں میں
خوبصورت وادیاں پاؤں پکڑتی ہیں میرے
سپنوں آنکھوں میں لیے ان سے گزر جاتا ہوں میں
اب بھی ہے وہ پیڑ قصبے کی حویلی میں حسن
جس کے نیچے جا کے بیٹھوں تو سنور جاتا ہوں میں

حسن عباسی/لاہور

امریکہ میں مقیم نامور سفرنامہ نگار اور محقق
فقیر اللہ خاں کا تازہ سفرنامہ
"یہ ہے لندن"
مکمل اہتمام سے شائع ہو گیا ہے
یہ لندن کے حوالے سے انتہائی معلوماتی
سفرنامہ ہے آف سیٹ پیپر 80 گرام مع رنگین تصاویر
صفحات 224 اور قیمت صرف 1000 روپے
منگوانے کے لیے براہِ راست کال کریں
030--4489310
نیز اپنی کتاب کی دیدہ زیب اشاعت کے لیے رابطہ کریں
نستعلیق مطبوعات، فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

بہ یاد: سید قاسم محمود
شاہکار علمی، ادبی اور فکری تحاریر کا جریدہ
ماہنامہ بک ڈائجسٹ
Book Digest
لاہور پاکستان
ISSN 2079-4584
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زرِ تعاون مبلغ -/2500 روپے
اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ درج ذیل
جاز کیش، یو پیسہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جاسکتا ہے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
برائے خط کتابت ترسیل زر/رابطہ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
042-37322996
0333-4377794
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

بھائی

روبنسن سیموئیل گل/ راولپنڈی

وہ سردیوں کی ایک ٹھٹھرتی صبح تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا سورج اور رات کی تاریکی کا آپس میں مقابلہ چل رہا ہے اور اب تک اندھیرے کا پلہ بھاری تھا۔ جا بجا چھائے بادل اور ہرسو پھیلی دھند سورج کی کرنوں کو زمین تک پہنچنے ہی نہ دیتے تھے کہ تاریکی مکمل طور پر چھٹ سکے۔ سہانہ اپنے گیارہ سالہ بھائی کو منہ اندھیرے ہی وین تک چھوڑنے آئی دراصل سانول کا گھر سکول اور مرکزی شہر سے کچھ فاصلے پر تھا جس کے باعث وین والا اسے سب سے پہلے لیتا اور سب سے آخر میں اتارتا تھا۔ اس کی بڑی بہن سہانہ قدرے تذبذب کا شکار تھی کہ آخر وین والا اب تک آ کیوں نہیں رہا۔ ہاں، گزرے دنوں کے بڑے صدمے نے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا تھا مگر زندگی تو بہرحال گزارنا ہی پڑتی ہے ناں! اب تو دو ہفتے گزر چکے تھے اور سانول نے بھی دو تین روز ہوئے دوبارہ سے سکول جانا شروع کر دیا تھا۔

سہانہ نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا تو خود کلامی کرتے ہوئے بولی: ''نہ جانے آج اس وین والے کو کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو کبھی اتنی دیر نہیں لگائی۔''

سہانہ اور اس کی جڑواں بہن فرزانہ دونوں فرسٹ ایئر میں تھیں جب کہ باقی تین بہنوں میں سے سب سے بڑی سکول ٹیچر تھی اور ایک نرس جب کہ تیسری نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کر رہی تھی۔ یہ سہانہ یا فرزانہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے بھائی کو وین تک چھوڑتی تھیں۔ ابو جان کچھ عرصہ بیرونِ ملک ملازمت کے سلسلے میں رہے تھے اب چند سال ہوئے وطن واپس لوٹے تھے۔ انہیں جس دن موقع ملتا تھا وہ اپنے بیٹے کو خود وین تک چھوڑ دیتے تھے۔ تاہم اب یہ ممکن نہ رہا تھا۔ لہٰذا سہانہ اور فرزانہ کی ڈیوٹیاں پکی ہو گئی تھی کہ اب سے وہی سانول کو چھوڑا کریں گی۔

ماں اکثر کہتی: ''چلو دو تین برسوں کی بات ہے پھر سانول خود ہی چلا جایا کرے گا۔''

اور ایسا ہی ہوا چند برسوں میں وہی سانول بہت سمجھ دار، ذمہ دار اور تجربہ کار ہو گیا۔ تاہم سردیوں کی وہ تلخ صبح سہانہ آج تک نہ بھولی تھی۔

آج سٹاف روم میں بیٹھے ہوئے جب ایک نرس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا: ''یہ بھائی بھی بس رعب ڈالنے اور بہنوں سے کام کروانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ ہر چیز میں نکتہ چینی اور باپ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اچھا ہوتا ہے جن کے بھائی نہیں ہوتے، کم از کم انسان آزادی سے زندگی تو گزار سکتا ہے۔''

اپنی کولیگ اینا کی بات سن کر سہانہ کو وہی صبح یاد آ گئی تھی۔ وہ بڑے پُراعتماد انداز میں بولی:

''نہیں اینا، ایسا نہیں ہے۔ باپ کے بعد بھائی ہی تو ہوتا ہے۔ جو آپ کا سب سے زیادہ خیال رکھتا، محافظ کی طرح آپ کی حفاظت کرتا اور اپنی خواہشوں بلکہ خود کو قربان کر کے بھی اپنی بہنوں کی خوشیوں کو پورا کرتا اور ان کی فکر کرتا ہے۔''

''لگتا ہے آپ کا بھائی بہت اچھا ہے۔''

اینا نے مسکراتے ہوئے کہا تو سہانہ بولی:

''نہیں، وہ بھی بہت غصے والا ہے۔ ہر وقت ہم پر نظر رکھنے والا اور کسی باڈی گارڈ کی طرح ہر وقت ہماری محافظت کرنے والا مگر بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں اور بھائیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ابھی بھی کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا تھا حالاں کہ میں بھی اب تین بچوں کی ماں ہوں اور وہ بھی شادی شدہ ہے۔ مگر آج بھی میری میرے بچوں کی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے۔ اگرچہ میں اور میرا شوہر دونوں ہی جاب کرتے ہیں تو بھی وہ وقتاً فوقتاً میرے اکاؤنٹ میں پیسے ڈال دیتا ہے۔ تمہیں تو ملکی حالات کا علم ہی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میرے شوہر کی جاب چھوٹ گئی تھی۔ تب بھی میرے بھائی نے میری بھرپور مالی مدد کی۔ امی کی بیماری میں بھی وہ اور بھابھی تمام اخراجات کا خیال رکھتے رہے، میرا بھائی تو لاکھوں میں ایک ہے۔

''میڈم آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو بڑا بھائی اور پھر کمانے والا بھائی مل گیا ہے۔''

اینا کی بات سن کر سہانہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی اور بولی: ''بڑا کہاں ہے، بے چارہ ہم پانچوں بہنوں سے چھوٹا ہے ایک وقت تھا جب ہم باڈی گارڈ کی طرح اپنے بھائی کی حفاظت کرتی تھیں۔ اسے ہر صبح وین تک چھوڑتی تھیں، وین والے سٹاپ سے ہی واپسی پر اسے لینے بھی جاتی تھیں۔''

اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ ایک آہ بھرتے ہوئے بولی: ''...اور پھر پتا ہی نہیں چلا ہمارا بھائی اچانک ہی بڑا ہو گیا۔''

سہانہ کی بات سن کر اینا بھی قدرے رنجیدہ ہو گئی مگر پھر ماحول کو بدلنے کے لیے پُرجوش انداز میں بولی:

''یہ تو اچھا ہوا ناں کہ آپ کا بھائی جلدی بڑا ہو گیا اور آپ بہنوں کی ذمہ داریاں کم ہو گئیں۔''

''ہاں، واقعی ہمارے سارے کا سارا بوجھ ہمارے چھوٹے بھائی نے جلد ہی اٹھا لیا، یقین کرو کہ جن کے بھائی نہیں ہوتے ان سے پوچھو کہ بھائی کتنے انمول اور باپ کے بعد واحد محافظ ہوتے ہیں۔... ویسے تمہارا بھائی کتنا بڑا ہے؟''

اینا بولی: ''میڈم، وہ تو صرف انیس سال کا ہے مگر میرے والد کی موجودگی کے باوجود میرا باپ بننے کی کوشش کرتا ہے۔''

اینا یہ تو اچھی بات ہے۔ بھائیوں کے اندر احساسِ ذمہ داری اور بہنوں کے لیے ان کی فکر و محبت ہی تو انہیں محافظ و باپ بننے کے لیے ابھارتی ہیں۔ ان بہنوں سے بھی پوچھ کر دیکھو جن کے بھائی آوارہ گرد یا نشے کا شکار ہو کر خاندانی ذمہ داریوں سے بالکل ہی سبکدوش ہو جاتے ہیں۔''

اسی دوران ایک مریض کے کراہنے کی آواز آئی تو سسٹر اینا بولی: ''میڈم، میں ذرا اس پیشنٹ کو انجکشن لگا کر آئی، پھر مجھے بتایئے گا کہ آپ کا چھوٹا بھائی اچانک کیسے بڑا ہو گیا تھا؟''

اینا کے جاتے ہی سہانہ نے چائے کی چسکی لی اور پھر اپنی کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر سر پیچھے کیا اور آنکھیں موندھے ایک بار پھر یادوں کے جھروکوں سے ماضی میں جھانکنے لگی۔ وہ آخری تھپڑ جو اس کو محسوس ہوا تھا۔

اینا واپس لوٹی تو یادوں کا یہ سلسلہ بھی موقوف ہو گیا۔ ''جی میڈم، اب بتائیں کہ آپ کا چھوٹا بھائی اچانک بڑا کیسے ہو گیا تھا؟''

سہانہ نے ٹشو سے اپنی پرنم آنکھوں کو پونچھا تو اینا فکر مندی سے بولی: ''میڈم سب ٹھیک تو ہے۔ آپ اتنی پریشان کیوں ہو گئیں؟''

سحانہ نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں ماضی کی ان تلخ یادوں پر سے وقت کے پرت اتارنے لگی۔

''اینا، ہماری زندگی کے وہ تلخ ترین اور نا قابلِ فراموش دن تھے۔ اگر چہ زندگی کی خوشیاں اور وقت کی ڈوریاں ان یادوں اور تلخ و شیریں تجربات پر لپٹتی چلی جاتی ہیں مگر ہم ان زخموں کو، اس درد کو بھولے تو نہیں ہوتے۔ کسی زخم پر محض پٹیاں باندھ دینے سے زخم ٹھیک نہیں ہو جاتا، ہاں نظروں سے اوجھل ضرور ہو جاتا ہے مگر درد کی ٹیسیں اس کی موجودگی کا احساس ہر دم دلاتی رہتی ہیں۔ ہمارے والد جو اس وقت تک ہمارے واحد کفیل رہے جب تک کہ بڑی دو بہنیں اپنے قدموں پر کھڑی نہ ہو گئیں۔ ہمارے اچھے مستقبل کے لیے ہمارے باپ نے اپنی ساری جوانی بلکہ تمام عمر پردیس میں گزار دی تا کہ ہم پڑھ لکھ جائیں۔ پانچ بیٹیوں کا بوجھ اٹھانا آسان تو نہیں ہوتا لیکن وہی مشرقی خیال کہ بیٹا ہو گا تو میری نسل کو آگے بڑھائے گا۔ اپنی بہنوں کا بوجھ اٹھائے گا۔ میرا نام روشن کرے گا اور بڑھاپے میں میرا سہارا بنے گا۔ مگر افسوس کہ ہم اپنے والد کا بڑھاپا دیکھ ہی نہ پائے۔ انہوں نے تو ہمیں خدمت کا موقع بھی نہ دیا اور بیمار ہوئے بغیر ہی اچانک اس دنیا سے چلتے بنے۔ ان دنوں میرا بھائی صرف گیارہ سال کا تھا۔ اسے ہمارے سہارے کی ضرورت تھی، وہ کیا ہمارا سہارا بن سکتا تھا، مگر ہمارے باپ کی اچانک موت نے اسے ایک دم سے بڑا کر دیا تھا۔''

پھر سہانہ رندھی ہوئی آواز میں بولی: ''اینا، میں وہ سرد صبح آج تک نہیں بھولی جب میں نے اپنے پیارے بھائی کے نرم و ملائم اور برف کی مانند سرد گال پر صبح صبح تھپڑ دے مارا۔ اس تھپڑ کی درد میں آج بھی اپنے وجود میں محسوس کرتی ہوں۔ اس روز وین والے نے آنے میں خاصی دیر لگا دی تو میں نے اپنے بھائی سے پوچھا کہ آخر وین والے انکل کیوں نہیں آ رہے تو میرا بھائی سانول بولا: ''باجی، میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ مجھے نہ لینے آئے کیوں کہ ہم اب غریب ہو گئے ہیں۔''

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے معصوم بھائی کے نرم و نازک گال پر تھپڑ دے مارا۔ یہ کہتے ہوئے سہانہ کی آنکھیں ایک بار پھر پرنم ہو گئیں۔ اینا متجسس انداز میں بولی: ''یہ تو آپ نے اچھا نہیں کیا لیکن آپ کے بھائی نے آخر یہ کیوں کہا کہ اب ہم غریب ہو گئے ہیں؟''

سہانہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ''اس لیے کہ اس روز ہم چھ بھائی بہنوں کو یتیم ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا اور گھر کے مالی حالات کو سنبھالنے اور ہمیں سہارا دینے کے لیے یہ اس کا پہلا اور بہت بڑا فیصلہ تھا کہ وین اور سکول کو خیر باد کہہ کر ہماری مالی معاونت کر سکے۔ اینا بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں، محافظ فرشتے مجھے اپنی غلطی کا بعد میں شدید احساس ہوا۔ ہم بہنوں نے پوری جان لگا کر اپنے بھائی کو پڑھایا اور خوش قسمتی سے اسے میڈیا میں اچھی ملازمت بھی مل گئی مگر ہم ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ہمارا چھوٹا بھائی اسی روز بڑا ہو گیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے سہانہ مسکرائی جب کہ اس بار اینا کی آنکھیں پرنم ہو چکی تھیں۔

پروفیسر عاصم بخاری/میانوالی

نظمیں

مدد

مدد تیرے گھر بیٹھے کب بھیجتا ہے
نکلتے ہو "فیلوں" کے جب تم مقابل
"ابابیل" عاصم وہ تب بھیجتا ہے

قبریں

سب کو دیتا ہے روز خبریں جو
یاد موت اس کو بھی نہیں اپنی
بیچتا ہے بنا کے قبریں جو

جمعہ

کتنا انعام ہے مرے رب کا
عید سے کم نہیں بخاری جی
روزِ جمعہ ہے حج فقیروں کا

چشمہ

چشمہ بھی اب بغیر ڈوری کے
کم ہی آنکھوں پہ اب ٹھہرتا ہے
عمر کے اب ہیں ایسے حصے میں

گھر

پوچھ جا کے کرایہ داروں سے
جس کا نعم البدل نہ دنیا میں
گھر وہ عاصم بخاری دولت ہے

کماد

زخمیوں کو کہاں، بچانے کو
گاڑی کے گرتے ہی، بخاری سب
لوگ بھاگے " کماد، کھانے کو

دعا

سوچتا ہوں کہ ہے کیا مانگے
بیمہ پالیسی کے لیے بیٹا
باپ کی موت کی دعا مانگے

انعام یافتہ

انجینئر ظفر محی الدین

خزاں کا موسم دور دراز سے سفر کرتا ہوا اُس کی سرزمین پر قدم رکھ چکا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ وہ دریاؤں، ندی نالوں، میدانوں اور درختوں سے ہوتا ہوا اُس کے صحن تک آ پہنچا۔ اُس نے خزاں کو اپنی دونوں بانہیں کھول کر گلے لگایا۔ اپنی سرزمین اور اپنے آنگن میں خوش آمدید کہا۔ اُس کا استقبال دیدنی تھا۔ خزاں کو خوش آمدید کہنا اور اُس کا والہانہ استقبال خود خزاں کے لیے بھی حیرت انگیز تھا۔ اُس کی ان غیر معمولی اور منفرد عادات کی وجہ سے اُس کے دوست اور قرب وجوار کے لوگ اُس کی ذہنی کیفیت کو نارمل نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ ایک سائیکو ہے۔ حالانکہ ایسا بالکل نہیں تھا بس اتنا تھا کہ وہ مثبت سوچ کا حامل غیر معمولی شخص تھا۔ عام لوگوں سے اُس کی سوچ منفرد تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے شخص کو ہمارے معاشرے میں پاگل، خبطی اور ذہنی مریض سمجھا جاتا ہے۔

لوگوں کے نزدیک خزاں ناپسندیدہ موسم تھا۔ درختوں سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ ہر طرف اُجاڑ پن اور ویرانی کا راج ہوتا ہے۔ اُداسی دلوں میں ڈیرے ڈال لیتی ہے۔ آنکھوں کو حدِ نظر تک سنسان منظر بھلے معلوم نہیں ہوتے مگر وہ پاگل شخص ان مناظر کے حُسن پر فدا تھا۔

اُس کا اپنا الگ نکتہ نظر تھا، وہ یہ کہ ہر چیز کا اپنا حُسن ہوتا ہے۔ ہم اُس حُسن کو دیکھ نہیں پاتے، اس لیے اُس کی قدر نہیں کرتے۔ اس کے خیال کے مطابق خزاں کی خوب صورتی اپنی جگہ، اس کے ساتھ ساتھ وہ بہار کی آمد کا استعارہ بھی ہے۔ خزاں جب رُخصت ہوتی ہے تو وہ ہمیں موسم بہار کا تحفہ دے کر رُخصت ہوتی ہے تو ایسی رُت کا استقبال ہمیں کھلے دل اور کھلے بازوؤں سے کرنا چاہیے۔

یہی رائے اُس کی رات کے بارے میں تھی۔ وہ کالی اور گہری راتوں کے حُسن سے بہت متاثر تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ رات بہت پُراسرار ہے۔ وہ انسان کو چھُپے رازوں سے آشنا کرنے والی اور خدا سے ملاقات کرانے والی ہے۔ ہم رات کی قدر نہیں کرتے۔ ہم اندھیروں کے قاتل ہیں۔ ہم اگر اندھیرے میں دیکھ نہیں سکتے تو یہ ہماری آنکھوں کا قصور ہے۔ اندھیرے کی ایک روشنی ہوتی ہے۔ اُس روشنی کا حُسن اس چکا چوند اور برقی قمقموں والی روشنی سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ اُس کو اکثر اپنی ان باتوں پر لوگوں کی طنزیہ مسکراہٹ کا سامنا کرنا پڑتا مگر وہ کسی بھی موڑ پر دلبرداشتہ نہ ہوتا۔

وہ لوگوں کے اس منفی رویوں سے تنگ آنے کی بجائے ان کو مثبت انداز میں سوچتا۔ اُس کا خیال تھا کہ لوگ معصوم ہیں۔ وہ اگر چیزوں کے اندر پوشیدہ خوب صورتیاں نہیں دیکھ سکتے تو یہ اُس کا فرض ہے کہ انہیں اس قابل بنائے کہ وہ دیکھ پائیں۔ خدا نے یہ ذمہ داری باذوق اور اہلِ فن کو سونپی ہے۔ خدا نے اس لیے ان کو ارفع ذہن عطا کیا ہے کہ وہ لوگوں کو باذوق بنانے کا فریضہ سرانجام دیں۔ اگر وہ یہ کام نہیں کر سکتے اور لوگ بے بہرہ رہتے ہیں تو اس میں لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔

اُس کی اس انتہا درجہ کی مثبت سوچ سے اُس کے گھر والے بھی تنگ تھے۔ خاص کر اُس کی بیوی جو کہ ساری دنیا سے نالاں رہتی تھی اور دُنیا کی ہر چیز میں اُسے نقائص نظر آتے تھے۔ ہر شخص کی برائیاں لے کر بیٹھ جاتی اور اُس کی خواہش ہوتی کہ اُس کا شوہر اُس کی ہاں میں ہاں ملائے مگر وہ کبھی ایسا نہ کرتا تو وہ غصے سے یہ کہہ کر اُٹھ جاتی کہ آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ اپنی معصوم طبیعت اور مثبت سوچ کی وجہ سے اُس نے زندگی میں بہت نقصان اُٹھائے۔ ملازموں نے اس کا کاروبار تباہ کر دیا۔ وہ کیش میں سے روپیہ غبن کرتے۔ اشیاء چوری کرتے۔ اس طرح اُس کا چلتا ہوا جنرل اسٹور بند ہو گیا۔ بظاہر تو یہ ناقابلِ تلافی نقصان تھا جس کی وجہ سے اُسے نااہل، بے وقوف اور نکما کے طعنے بھی سننے پڑے لیکن وہ سمجھتا تھا کہ ملازموں کو رقم کی ضرورت تھی۔ وہ مجبور تھے ورنہ وہ چوری اور کرپشن جیسے جرائم کیوں کرتے۔ اس پر بھی وہ خود کو موردِ الزام ٹھہراتا کہ اُسے ان کی ضروریات کی خبر ہونا چاہیے تھی اور یہ اُس کی ذمہ داری تھی کہ اُن کو پورا کرتا۔ اگر اُس نے اپنی ذمہ داری نبھائی ہوتی تو انہیں چوری نہ کرنا پڑتی۔ اُس کی انہی باتوں کی وجہ سے لوگ اُسے خبطی، کند ذہن، پاگل اور دیوانہ کہتے تھے۔

پھر ایک دن اس تمام صورت حال میں انقلابی تبدیلی آئی۔ اُس کی وراثتی جائیداد جس کے بارے میں وہ بالکل بے خبر تھا، حکومت کی طرف سے اُسے الاٹ کر دی گئی جس کی مالیت کروڑوں روپے تھی۔ یہ اُس کی نیک نیتی اور صلہ رحمی کا صلہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کانٹوں کی موجودگی میں پھول سے خوشبو نہ آئے۔ وہ اپنی سابقہ روش پر قائم رہا۔ اُس نے اپنی جائیداد سے آنے والی لاکھوں روپے کی سالانہ آمدنی انہی لوگوں کی ضروریات پورا کرنے میں خرچ کرنا شروع کر دی جو اُسے طنز و تشنیع کا نشانہ بناتے تھے۔ اُس کے اس عمل سے سب اُس کی مدح میں رطب اللسان ہو گئے۔ اُس کی ہر بات کی ہاں میں ہاں ملاتے اور اُس کی قسمت پر رشک کرتے لیکن وہ اُن کی خوشامد اور تعریف سے بھی اُسی طرح بے نیاز رہتا جس طرح تنقید سے لاپروا رہتا تھا۔ کیونکہ وہ قدرت کی طرف سے انعام یافتہ تھا۔

✧✧✧

خزاں کے رنگ

عامر بن علی/ جاپان

پت جھڑ کتنا خوبصورت لفظ ہے۔موسم کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس رت کے دوران بیتنے والے قدرتی حالات و واقعات کو بھی بیان کر دیتا ہے۔جاپان کا چونکہ لگ بھگ (80%) اسی فیصد رقبہ پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل ہے۔پہاڑ بھی سرسبز، درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔اسی لیے خزاں کی دستک سے جاپان کا رنگ بدل جاتا ہے۔جدھر نظر دوڑائیں، سبزے کی جگہ زردی اور نارنجی رنگ غالب ہوتا نظر آتا ہے۔

یہاں بہار کے جوبن پر جب چیری کے درختوں کی شاخیں پھول اٹھاتی ہیں تو ''چیری بلاسم'' دیکھنے کے لیے لوگ اہل خانہ اور دوستوں کے ہمراہ پھولوں سے لدے ان درختوں کے نیچے چٹائیاں بچھا کر، سامان خورونوش کے ہمراہ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک تہوار ''ہنامی'' مناتے ہیں۔اسی طرح خزاں کے موسم میں بھی جب درختوں کے پتوں کا رنگ زرد ، نارنجی اور سرخ ہونے لگتا ہے اور وہ پت جھڑ کی ہواؤں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں، تو بہت سارے جاپانیوں کے نزدیک یہ تہوار کا موقع ہے۔روایتی طور پر لوگ جوق در جوق گھروں سے نکلتے ہیں، اور فطرت کے قریب کہیں پناہ لیتے ہیں۔کہیں ٹولیوں کی شکل میں کسی پہاڑی پر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔کہیں تنہا تنہا جنگل کا رخ کرتے ہیں۔دریاؤں کے کنارے بھی خزاں کے گرتے پتوں کی آہٹ سننے اور درختوں کے بدلتے رنگ دیکھنے کا مقبول مقام ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے بہار میں چیری بلاسم کے تہوار کے لئے رائج لفظ ''ہنامی'' کا لفظی ترجمہ پھول تکنا ہے۔خزاں کے رنگ بدلتے، گرتے پتوں کا نظارہ کرنے کے لئے جانے کو ''زرد پتوں کا شکار کھیلنے'' کے لئے جانا کہتے ہیں۔یوں کہہ لیجئے کہ سوکھے پات دیکھنے جب لوگ پت جھڑ کے موسم میں گھر سے نکلتے ہیں تو ''مومی جگاری'' اسے کہتے ہیں۔

ایک ہزار سال سے بھی پرانی شاعری میں اس تہوار کے تذکرے موجود ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی جسے یہاں ''نارا'' عہد کہتے ہیں، اس زمانے کی شاعری کا یہ محبوب موضوع ہے۔ہمارے ہاں فیض احمد فیض نے اسی موسم میں لکھی ایک معروف نظم میں پاکستان کو ''زرد پتوں کا بن'' بھی کہا ہے۔چونکہ مستقل یہاں موسم خزاں کا راج دیکھتے تھے۔اور قانون کے نفاذ کے حوالے سے اس دیس کو جنگل محسوس کرتے تھے۔اسی لئے اسے درد کی انجمن بھی لکھتے تھے۔پس دیوار زنداں تحریر کردہ شاعری میں فیض کے کلام کا بہت نمایاں مقام ہے۔

خزاں کا رنگین اور دلکش منظر فقط فطرت کا کرشمہ نہیں ہے۔ان مناظر کی آبیاری بہت سے نیک دل لوگوں نے کی ہے۔اس کی ایک مثال ٹویوٹا کمپنی کی وجہ تسمیہ اور گاڑیاں بنانے والے اسی ادارے کے ہم نام شہر میں جو پت جھڑ کا حسین منظر نظر آتا ہے، اس نظارے کا سبب سترہویں صدی عیسوی میں ایک بدھ مت کے پیروگار اور معبد کے مہا پنڈت کے ہاتھوں سے لگائے گئے چار ہزار میپل کے درخت ہیں۔بدھ عبادت گاہ کے اردگرد کے علاقے میں پروہت کے لگائے گئے درختوں کے پتے خزاں کے موسم میں زمین پر زرد اور نارنجی چادر بچھا دیتے ہیں۔منظر کا حصہ بننے والے ان ادھ مڑے، زرد، خشک، نارنجی پتوں پر اگر پیدل چل کر دیکھیں تو احساس یہی ہوتا ہے۔جیسے کسی دبیز قالین پر قدم رکھ رہے ہیں۔

یہاں پر خزاں کا انتخابی نشان باقی دنیا کی طرح میپل کا پتا ہے۔میپل کو اردو اور فارسی میں ''افرا'' کہتے ہیں۔مگر میرا خیال ہے کہ قارئین کی اکثریت کے نزدیک ''افرا'' کی نسبت میپل زیادہ مانوس ہوگا۔گرچہ آج کل پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں افرا لڑکیوں کا مقبول نام ہے۔مجھے پروین شاکر کی شاعری سے یہ شکوہ رہتا تھا کہ وہ ان پھولوں اور پیڑوں کے استعارے استعمال کرتی ہے۔جو ہم نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہیں۔ان کی شاعری میں رات کی رانی کی خوشبو کا تذکرہ ہو یا پھر املتاس کے پیڑ پر لگے پھول، کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔اسی لیئے مجھے شوکمار بٹالوی کا ''شرینہ دا پھل'' کے نام سے شعری مجموعہ دیکھ کر زیادہ اچھا لگتا اور سمجھ بھی آتی تھی۔مگر واقعہ کچھ یوں ہوا کہ ایک حسین شام ایک باغیچے میں بیٹھے تھے۔کہ کہیں سے بڑی دل آویز مہک ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی تو کسی نے بتایا کہ یہ رات کی رانی کی خوشبو ہے، پچھلے برس لاہور کے ایک رہائشی علاقے میں اہل خانہ کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے، اردگرد لگے درختوں کی بابت پوچھا، جن پر لدے، پھندے، پیلے رنگ کے پھول اپنے حسن سے مبہوت کیئے جا رہے تھے۔پتہ چلا کہ یہ املتاس کے پیڑ ہیں، جن پر بسنتی رنگ کے پھول سجے ہیں۔اس روز میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی بھی پھول اور پیڑ پرایا نہیں ہوتا۔

پہاڑی جنگلوں میں دور تک نکل جانے والے جاپانی لوگوں کے لئے سرخ اور ادھ مڑے پیلے پتوں کا مطلب، آنے والے تنہائی اور طویل موسم سرما کے دن ہیں۔یاد رہے کہ شدید سردی اور برفباری کے باعث یہاں کے زیادہ تر علاقوں میں نقل و حرکت محدود ہو جاتی ہے۔پہاڑوں اور جنگلوں میں جانا تو خیر ممکن ہی نہیں رہتا ہے۔سرما کی قید سے پہلے آزادی کے چند دنوں کا یہ جشن ہے۔مگر حزن اور اداسی کے رنگ واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔تاریخی طور پر فقط مذہبی مقامات کے گردونواح میں پت جھڑ سے متعلق محفلیں ہوتی تھیں اور خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔مگر اب مذہبی رنگ اس تہوار میں پھیکا پڑ گیا ہے، اور ثقافتی و سماجی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

بلقیس ریاض

میری امی کو فکر ہوئی کہ اس بارے میں کچھ کرنا چاہیے، ہمیں جو مولوی صاحب قرآن شریف پڑھانے آتے تھے، میری والدہ کے کہنے پر انہوں نے ہی ہمیں اردو زبان پڑھانا شروع کر دی۔ پانچویں جماعت میں ہوئی تو ہماری ٹیچر نے پوچھا کہ کسی بچی کو اُردو پڑھنا آتی ہے؟ تو میں نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی کہ آپ بچوں کو کہانیاں پڑھ کر سنائیں، اس عمل سے مجھے مزید شوق پیدا ہو گیا۔

ارژنگ:۔ لکھنے کا سلسلہ کیسے آگے بڑھا؟ پہلی کتاب کب شائع ہوئی؟

بلقیس ریاض:۔ لکھتے لکھتے میں نے ایک ناول مکمل کر لیا، اس کا عنوان ''دل اور دیوار'' تھا۔ جو بعد ازاں ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ بھی ہوا، ڈرامے کی شکل میں۔ اس کے بعد میرا رجحان افسانہ نگاری کی طرف ہوا اور پھر کالم لکھنا بھی شروع کر دیا۔ یہ 1980 کی بات ہے جب میرا پہلا ناول شائع ہوا اور اس کی اشاعت کا سارا اہتمام معروف شاعر نجیب احمد نے کیا تھا جو کہ میرا بھتیجا بھی تھا۔ دوسرا ناول مکمل کیا تو نامور کالم نگار عبدالقادر حسن کی اہلیہ رفعت جو کہ میری بہت اچھی سہیلی تھی، وہ مجھے مشہور اشاعتی ادارے سنگ میل لے کر چلی گئی، جہاں نیاز احمد صاحب سے ملاقات ہوئی، جو کہ اس ادارے کے موجودہ سربراہ افضال احمد کے والد تھے، بڑی خنداں پیشانی سے پیش آئے اور کہنے لگے کہ میں یہ کتاب چھاپ دوں گا۔ اس کے بعد ایک اور کتاب اور پھر ایک سے زائد۔ اسی دوران میں نے سفرنامہ حرمین لکھا، اس کی بہت زیادہ پذیرائی اور ستائش ہوئی۔ سنجیدہ اور ثقہ اہل قلم نے اس پر مجھے داد دی اور تحسین بھی کی، اصغر ندیم سید نے خصوصی طور پر فون کر کے کہا کہ یہ سفرنامہ پڑھ کر میرا دل کرتا ہے کہ ابھی اڑ کر مکہ، مدینہ پہنچ جاؤں۔ اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بیٹی کی شادی امریکہ ہوئی تو اس سے ملنے میں وہاں گئی اور اسقیام کے دوران میں نے امریکہ کا سفرنامہ لکھا۔

ارژنگ:۔ آپ طویل عرصے سے روزنامہ نوائے وقت کے ساتھ منسلک ہیں، یہ تعلق کیسے پیدا ہوا؟ یہ تجربہ کیسا رہا؟

بلقیس ریاض:۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح ہوا کہ مجھے برطانیہ جانے کا موقع ملا۔ وہاں مجھے طویل عرصے سے مقیم پاکستانی گھرانوں کے ساتھ ملاقات کا موقع ملا۔ یہ لوگ زیادہ تر میرپور آزاد کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ میں نے ان کو اپنی اولادوں کے بارے میں متفکر پایا۔ ان کے بچے عمومی طور پر بے راہ روی کا شکار تھے اور مغربی ماحول میں ایسے پھنستے چلے جا رہے تھے جیسے دلدل میں لوگ دھنستے چلے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے سفر کا احوال اور اس موضوع پر اپنے جذبات کا اظہار چھ کالموں میں تحریر کر دیا۔ یہ کالم تحریر کر کے جب میں پاکستان پہنچی تو میں نے بیدار سرمدی کو فون کیا جو ان دنوں نوائے وقت کے سنڈے میگزین کے انچارج تھے۔ جب یہ کالم شائع ہوئے تو مجھے مجید نظامی صاحب نے بلایا اور کہا کہ اگر آپ اسی طرح کے مستقل کالم تحریر کرنا چاہتی ہیں تو ہمارا ایک سلسلہ ''دیارِ غیر'' کے نام سے مستقل اخبار کا حصہ ہے، ان کی دعوت پر پھر میں نے اخبار میں مستقل کالم لکھنا شروع کر دیا۔ اس واقعے کو چالیس سال گزر گئے ہیں اور میں اگر لاکھوں نہیں بھی تو ہزاروں کالم لکھ چکی ہوں۔ یہ تمام کالم نوائے وقت میں ہی شائع ہوتے ہیں۔

ارژنگ:۔ آپ کے اب تک بائیس سفرنامے شائع ہو چکے ہیں، سفرنامہ نگاری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

بلقیس ریاض:۔ میرے میاں جسٹس ریاض احمد شیخ جب سپریم کورٹ کے جج بن کر اسلام آباد منتقل ہوئے تو انہیں مختلف ممالک میں منعقد ہونے والی کانفرنسز میں مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ جس ملک میں بھی جاتے، مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ میں وہاں کانفرنس کا احوال بھی لکھتی اور سفرنامے کا خاکہ بھی تیار کر لیتی تھی۔ میرے خاوند نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے لکھتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ میری سفرنامہ نگاری مین میرے میاں کا اہم کردار ہے۔

ارژنگ:۔ آپ نے پچاس کتابیں شائع کرنے کا جو سنگ میل عبور کیا ہے، اس پر کچھ کہنا پسند کریں گی؟

بلقیس ریاض: دراصل میری 48 کتابیں شائع ہو چکی تھیں جنہیں مقبول اکیڈمی اور سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ گزشتہ برس گرمیوں میں میرا بیٹا رضا رومی

ملنے کے لئے پاکستان آیا(معروف صحافی اور لکھاری رضا رومی) تو کہنے لگا کہ امی کبھی آپ کی کسی کتاب کی تقریب رونمائی نہیں ہوئی۔ آپ کی پچاس کتابیں مکمل ہوجائیں تو ہم سب کی اکٹھی تقریب رونمائی کریں گے۔ آج سے پچیس سال پہلے میری دو کتابوں کی تقریب رونمائی پی سی ہوٹل لاہور میں ہوئی تھی، ظاہر ہے یہ اب پرانی بات ہے۔ سنگِ میل نے حال ہی میں میرا ناول ''طوفانی رات'' شائع کیا تو یہ تعداد پچاس تک پہنچ گئی۔ رضا رومی بھی آج کل پاکستان آیا ہوا ہے، اسی نے ہی اس تقریب کا اہتمام کیا۔ یہ کتابیں میری زندگی کا اثاثہ ہیں۔

ارژنگ:۔آپ نے اپنے بیٹے کا ذکر کیا، لکھنے کا فن کیا آپ نے انہیں سکھایا؟ تربیت دی؟

بلقیس ریاض:۔مجھ سے اکثر یہ سوال ہوتا ہے کہ آپ کا بیٹا بھی رائٹر ہے، وہ آپ پر گیا ہے؟ میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ لکھنے کا ورثہ چاہے اس نے مجھ سے لیا ہو مگر ٹیلنٹ اپنے والد سے لیا ہے۔

ارژنگ:۔آپ ناول بھی لکھتی ہیں اور افسانہ نگار بھی ہیں، کالم نویسی کے ساتھ ساتھ سفرنامہ نگاری بھی کرتی ہیں، ان تمام اصناف سخن میں سے آپ کو زیادہ کون سی صنف ادب محبوب ہے؟

بلقیس ریاض:۔مجھے ذاتی طور پر سفرنامہ نگاری زیادہ پسند ہے۔ اس کی وجہ بھی میں آپ کو بتا دیتی ہوں سفرنامہ نگاری میں ادب کی کم و بیش تمام اصناف ہی سما سکتی ہیں۔

ارژنگ:۔کبھی کسی ادبی تحریک کا بھی حصہ بنیں؟ کسی سیاسی وسماجی جماعت کے ساتھ چلیں؟

بلقیس ریاض:۔اتفاق ایسا ہے کہ مجھے اس کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ میں اپنی زندگی اور لکھنے کے عمل میں اس قدر مگن تھی کہ مجھے کسی تحریک میں جانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ گزشتہ چالیس سال سے تو نوائے وقت میں لکھ رہی ہوں، اس کے علاوہ یہ پچاس کتابیں آپ کے سامنے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ باقی زندگی بھی اسی طرح لکھتی ہی چلی جاؤں۔

ارژنگ:۔ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کا سوال ہے تو پرانا مگر آج بھی اہم ہے، آپ کا اس بابت کیا خیال ہے؟

بلقیس ریاض:۔میں عام فہم زبان میں عام لوگوں کے لئے لکھتی ہوں اور ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔

ارژنگ:۔قارئین کی دلچسپی کے لئے آپ اپنی کتابوں کی تفصیل بیان کرنا پسند کریں گی؟

بلقیس ریاض:۔جی ضرور! ناول اور دیگر کتب کے نام درج ذیل ہیں۔

1۔دل اور دیوار (اس ناول کا PTV میں ڈرامہ بھی ٹیلی کاسٹ ہوا)

2۔مہوش (ناول) 3۔حادثے (ناول)

4۔بادبان (ناول) 5۔آسمان تلے (ناول)

6۔تجدید وفا (ناول) 7۔انجان (ناول)

8۔خبطی (ناول) 9۔کرن کہانی (ناول)

10۔مسیحا (ناول) 11۔خلش (ناول)

12۔انا (ناول) 13۔سایہ شجر (ناول)

14۔پشمان (ناول) 15۔دھندلا پیکر (ناول)

16۔اجالا (ناول) 17۔دام سحر (ناول)

18۔نیلا آسمان (ناول) 19۔طوفانی رات (ناول)

افسانوں کی کتابوں کے نام

1۔خوابوں کا محل 2۔ندامت کے آنسو

3۔جنت 4۔نئے افسانے

5۔بندھن 6۔خوابوں کا محل

7۔ہرجائی

سفرناموں کے نام

1۔بحرظلمات سے آگے

2۔سفرحرمین

3۔جہاں اور بھی ہیں

4۔خوابوں کی جنت

5۔افق کے اس پار

6۔اوسلو سے آگے

7۔چین کو چلئے

8۔انوکھا سفر

9۔جہاں حسن جوان ہے

10۔سفر ہے شرط

11۔نیلا منزل

12۔روم کے جادوئی کشش

13۔دہلی سے آگے

14۔اوٹاوا

15۔آسٹریلیا خوبصورت ہے

16۔نیلسن منڈیلا کے دیس (ساؤتھ افریقہ میں)

17۔جہاں خزاں بھی بہار ہے

18۔دیار غیر سے

19۔اتھیکا حسین ہے

20۔ساحل سے ساحل تک

21۔عمر خیام کے دیس میں

22۔امریکہ میں رمضان شریف

✦✦✦

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

ان دنوں یہ بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔ یہی وہ دن تھے جب میرا ادبی دنیا سے تعلق استوار ہوا۔ کالج کے دنوں میں میری شاعری ''اوراق''، ''فنون''، ''ماہ نو'' اور ''شاعر'' جیسے معیاری رسائل میں شائع ہونے لگی۔ ان دنوں راجہ رسالو کی وجہ سے پاکستان رائٹرز گلڈ میں ابھی کچھ جان باقی تھی۔ میں کالج کے زمانے میں اس کا رکن بنا۔ اس کے بعد ملتان میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو اور ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان پاس کیا۔ زندگی کی صلیب اپنے کندھوں پر خود اٹھانے کے لیے چھوٹی موٹی ملازمتیں بھی کرنا پڑیں۔ 2005ء میں میرا پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے لیکچرر اردو کے طور پر تقرر ہوا۔ 2016ء میں ایک بار پھر پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سے مجھے لیکچرر سے براہ راست ایسوسی ایٹ پروفیسر منتخب کرلیا گیا۔ 2021ء میں ترقی پاکر پروفیسر بن گیا۔ آج کل میں اپنی مادر علمی گورنمنٹ کالج ساہیوال میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ملازمتی امور انجام دے رہا ہوں۔ اس دوران میں مجھے اسلام آباد اور لاہور کی جامعات میں ملازمت کی آفر ہوئی لیکن کچھ ذاتی مسائل کی وجہ سے انکار کرنا پڑا۔ ہمارے ہاں بہت سے اساتذہ پڑھتے نہیں بس پڑھاتے ہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح کتابوں کی دنیا سے وابستگی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے ملازمت کے دوران بھی حصول تعلیم کے سلسلے کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھا۔ میں نے 2009ء میں ''اردو ادب اور تحریک آزادی فلسطین'' کے عنوان سے ایم۔ فل اور 2016ء میں ''کلاسیکی اردو غزل میں سراپا نگاری'' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان دنوں میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے شعبہ اقبالیات سے پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلوشپ پراجیکٹ کے تحت وابستہ ہوں۔ سو چند جملوں کی غیر دلچسپ سی یہ حکایت پیش خدمت ہے۔ جہاں تک ادبی زندگی کے باقاعدہ آغاز کا تعلق ہے تو عرض کروں کہ میرے لکھنے کی ابتدا شاعری سے ہوئی، سید جعفر شیرازی سے اصلاح سخن لی۔ ملتان میں قیام کے دنوں میں ڈاکٹر عرش صدیقی، ڈاکٹر اسلم انصاری، حفیظ الرحمان خان اور جاوید اختر بھٹی جیسے لوگوں کے ہاں شعر و نثر کے تنوع نے مجھے اپنے اظہار کا کینوس وسیع کرنے پر آمادہ کیا۔ ان لوگوں کی صحبت میں میرا رجحان تنقید و تحقیق، کالم نگاری اور ترجمہ کاری کی طرف بھی ہوگیا۔ میں نے باقاعدہ ان سے اصلاحیں لیں اور طویل مکالمے کیے۔ انھوں نے مجھے قدیم اور جدید متون کے مطالعات پر آمادہ کیا۔ ابتدا میں میرا شعری مجموعہ ''نیلے چاند کی رات'' شائع ہوا۔ اس کے بعد دیگر کتابیں ''پاکستانی ادب کا منظر نامہ''، ''آثار جنوں''، ''شہر غزل کے بعد''، ''اصناف شاعری''، ''اصناف نثر''، ''ڈاکٹر اسلم انصاری شخصیت اور فن''، ''اردو ادب اور آزادی فلسطین''، ''اردو غزل میں سراپا نگاری''، ''کلیات نثر: مجید امجد''، ''مجید امجد نئے تعینات''، ''شواہد الالہام از مولانا حالی (تدوین)''، ''ڈاکٹر الف د نسیم شخصیت اور فن''، ''حفیظ الرحمان خان: شخصیت اور فن''، ''تذکرہ مہ و سال'' اور ''فلسطین کی منتخب کہانیاں کے تراجم'' کے عنوان سے منظر عام پر آئیں۔ کچھ عرصہ پہلے میری کچھ کتابیں ہمسایہ ملک انڈیا سے بھی شائع ہوئیں۔ فلسطینی تراجم کی کتاب ایران کا ایک اشاعتی ادارہ شائع کرنا چاہتا ہے۔ کچھ کتابیں پاکستان میں بھی زیر طبع ہے۔ چند سالوں سے ''نوائے وقت'' میں ''سرمایۂ افتخار'' کے عنوان سے علمی، ادبی اور تہذیبی کالم لکھنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ میں ابھی تک حرف معتبر کی تلاش میں ہوں۔ یوں تو دفتر تحریر کیے لیکن سچ پوچھیے تو ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھ سکا جس پر فخر تو کیا اطمینان بھی کیا جاسکے۔ ایک خوشی البتہ یہ ہے کہ میں نے اپنے محدود علم کے مطابق صدق دل اور تسلسل سے لکھا۔ زاویہ نشینی کے اس عمل میں بہت سی بلائیں ڈرانے آئیں، کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہیں کی۔ میرے ادبی کام پر احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، وزیر آغا، اسلم انصاری، شمس الرحمان فاروقی، محسن بھوپالی، ظفر اقبال مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر لدمیلہ ویسلویا اور انتظار حسین جیسے مشاہیر نے مضامین لکھے، ساہیوال آبادی اور حدود اربعہ کے لحاظ سے بڑا شہر نہیں لیکن عظیم ادب روایات کا امین ہے۔ ہم نے یہاں حلقہ ارباب ذوق کی شاخ بنائی اور شہر کی ادبی یبوست کا خاتمہ کیا، ساہیوال آرٹس کونسل کے تحت شہر میں عالمی ادبی کانفرنسوں کے انعقاد میں بھرپور معاونت کی۔ ٹیگور ایک نظم میں لکھتے ہیں کہ:

''ڈوبتے ہوئے سورج نے پوچھا، کوئی ہے؟ جو میرے بعد روشنی کرے۔ سبھی خاموش رہے، ایک ننھا سا چراغ بولا، ''جب وقت آیا تو دیکھ لیں گے''۔ میں نے بھی دیگر احباب کے ہمراہ بساط بھر کوشش کی کہ یہ چراغ روشن رہے۔

سوال: شاعری کا محرک کون سی چیز یا واقعہ تھا؟ کیا شاعر پیدائشی ہوتا ہے۔

جواب: میری ناقص رائے کے مطابق بچپن ہی سے ہمیں انسانی زندگی کے تحیرات کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ہم اس سے کچھ نہ کچھ کشید کرتے ہیں۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ایک شاعر تو فطری طور ہر انسان میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے۔ البتہ یہ وقت اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ شخص زندگی کے ان رطب و یابس کو کہاں تک اہمیت دیتا ہے۔ فارسی میں کہتے ہیں، ''ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد''۔ اگر تو اس نے ایتھر کی طرح بے جان لوگوں میں رہتے رہتے خود کو ویسا ہی بنالیا تو شاعری، مصوری، خطاطی، رقص یا فنون لطیفہ کی دیگر خصوصیات سے تہی ہوتے دیر نہیں لگتی، ایسے لوگ زندگی میں بڑے کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ نے کسی نہ کسی طرح اپنے اندر کے حساس انسان کو مرنے سے بچا لیا تو پھر آپ کو آگہی کی ایک ایسی دولت نصیب ہوتی ہے جو انبیا، صوفیا اور صالحین کا نصیب ہے۔ ایک شاعر یا ادیب تخلیقی عمل کے دوران اس تجربے سے گزرتا ہے جو ایک ماہر فلکیات کو کائنات کے مشاہدے میں حاصل ہوتا ہے۔ شاعر کا مشاہدہ بھی اس مقام پر بہ منزلہ تجربہ ہوجاتا ہے۔ یہ عمل خاصا اذیت ناک ہے، میرزا محمد رفیع سودا کا ایک شعر ہے:

سودا جو بے خبر ہے کوئی وہ کرے ہے عیش
مشکل بہت ہے ان کو جو رکھتے ہیں آگہی

میں نے اوائل عمری میں زندگی کو مختلف رنگ و روپ میں دیکھا، یہ مجھے ایک نیلے سے پروں والی چڑیا لگی تو کبھی آکٹوپس کی طرح تندخو۔ میں نے اسے جس پہلو سے بھی دیکھا اپنی بے توقیری کا احساس ہوا، میری مثال ایک صحرائی درخت کی تھی، جسے اپنی نمو کے لیے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے، معاشرے میں موجود سیاسی، سماجی اور مذہبی

منافقت کے راز مجھ پر عام آدمی سے زیادہ منکشف ہوئے۔اس موقع پر میرے اندر ایک سہمے سہمے سے شرمیلے باغی نوجوان نے جنم لیا، مجھے علم نہیں کہ شاعری کیسے میرے اظہار کا وسیلہ بنی۔معیشت کی صعوبت ہو یا محبت کی افتاد دونوں صورتوں میں اسی نے میری دلجوئی اور دستگیری کی۔

سوال: جدید اور قدیم ادب میں وقوع پذیر تبدیلیوں کے منفی و مثبت اثرات کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: جہاں تک جدید اور قدیم کی بات ہے تو میں زمانے کی اس رو کو ایک خاص زاویہ نگاہ کے ساتھ دیکھتا ہوں۔علامہ اقبال نے کہا تھا:

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

ادب جدید یا قدیم نہیں بلکہ زمانے کی ایک رو کے تابع ہے۔آپ تو خود کلاسیکی عہد پر گہری نظر رکھتی ہیں، میں نے کچھ عرصہ پہلے کسی ادبی جریدے میں کلاسیکی غزل پر آپ کا ایک خوب صورت مضمون دیکھا ،قدیم شعری تذکرے دیکھیں تو شعرا کا ایک جم غفیر دکھائی دیتا ہے۔بہت سے شعرا تو ادبی تذکروں کے مردہ خانوں میں لاوارث لاشوں کی طرح پڑے ہیں۔اس کے برعکس محمد تقی میر کے شعری موضوعات ہمارے عصری مسائل کی آج بھی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔گزشتہ صدی میں حالی اور اکبر کو جدت کا ترجمان کہا گیا۔مولانا حالی ''انگریزی لالٹینوں'' کی روشنی میں جدید افکار کے پیام بر ہیں لیکن ان کا اسلوب قدیم ہے، اکبرالہ آبادی اسلوب کے لحاظ سے جدید ہیں لیکن ان کے ہاں سطحی نوعیت کی قدامت پسندی ملتی ہے۔اگر ہم جدیدیت مروجہ اصطلاح کے تناظر میں دیکھیں تو ہم ''ادھورے جدید'' ہیں۔ایک بڑا شاعر قدیم اور جدید کے اصولوں سے ماورا ہوتا ہے۔یہ قدیم جدید یا مجازی وحقیقی کی باتیں ہماری جامعات کے اساتذہ کی وضع کردہ ہیں تاکہ بچوں کی اخلاقی قدریں مجروح نہ ہوں۔آپ کے ساجی اور جمالیاتی اصولوں پر پورا اترنے والی ہر قسم کی شاعری آفاقیت رکھتی ہے، اور قدیم وجدید کے اصولوں کے تابع نہیں۔ایک بڑے ادیب کا ہاتھ ہر زمانے کی نبض پر ہوتا ہے۔ جہاں تک وقت کے بہاؤ کا تعلق ہے تو ہر عہد کا اہم ادیب اپنے زمانے کے چند باشعور افراد میں شامل ہوتا ہے۔

سوال: کیا جدت طرازی نے شاعری کے رنگوں کو مزید نکھارا ہے؟ آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں۔

جواب: جدت سے کچھ نئی باتیں تو سامنے آتی ہیں۔جب اردو کا دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب کے ساتھ معانقہ ہوا تو جدید موضوعات بھی ہماری شاعری میں در آئے۔اس سلسلے میں تراجم نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔بات کلاسیکی دور میں محبوب کے عارض ورخسار کی تعریف سے شروع ہوئی تھی اور اب اس میں بہت سے نئے رجحانات بھی شامل ہو گئے ہیں۔آج کا اردو شاعر ''عالمی گاؤں'' کا فرد ہے ،ایک زمانے میں اس کی فارسی،عربی اور انگریزی تک رسائی تھی،لیکن جدید عہد کی ایجاداتی تبدیلیوں نے اسے افریقہ کے غیر متمدن قبائل کے ادب سے لے کر امریکہ کے سرخ ہندیوں (Red Indiands) تک کے شعری موضوعات سے آشنا کر دیا ہے۔آگاہی کی یہ صورتیں براہ راست ترجمہ اور ترجمہ در ترجمہ کے عمل سے وقوع پذیر ہوئی ہیں۔دنیا کی مختلف تہذیبیں باہم فکری اشتراکات کے باوجود اپنی انفرادی شناخت بھی رکھتی ہیں۔بیسویں صدی میں شاعری کی نئی اصناف کے اردو میں متعارف ہونے سے بھی مثبت تبدیلی آئی ہے۔ہمارے شعری موضوعات میں تنوع پیدا ہوا ہے۔آج کا اردو قاری امریکہ کے سرخ ہندیوں اور افریقہ کے سیاہ فام لوگوں کے ادب سے بھی آشنا ہے۔اس صورت حال میں اردو شعرا کے موضوعاتی آفاق مزید وسیع ہو گئے ہیں۔

سوال: غالب کا انداز بیان تو کچھ اور ہے ہی، غالب کے بعد کس کی شاعری میں یہ جھلک دکھائی دیتی ہے؟

جواب: لیلیٰ صفدر صاحبہ! آپ نے بجا کہا ،واقعی ڈیڑھ صدی کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی مرزا اسداللہ خان غالب بدستور غزل کے راج سنگھاسن پر براجمان ہیں۔ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تحقیق کے مطابق غالب کے عہد میں غالب تخلص کرنے والے پانچ شاعر اور بھی تھے لیکن پانچوں غالب کے ہاتھوں مغلوب ہو گئے۔میری طالب علمانہ رائے اس سے ذرا مختلف ہے۔دراصل شہرت بھی دولت، صحت اور قبولیت کی طرح رزق کی ایک قسم ہے۔مرزا غالب پر یہ بات خاص طور پر صادق آتی ہے۔غالب کے اردو دیوان کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی طور پر بیدل عظیم آبادی کی مشکل پسندی کے زیر اثر فارسیت زدہ شعر کہتے رہے۔خواجہ عباداللہ اختر نے ان کے متعدد ایسے شعر درج کیے ہیں جو براہ راست بیدل کے کلام کا اردو ترجمہ ہیں۔انھوں نے مومن خان مومن سے بھی اثرات قبول کیے۔چند غزلیں ہیں جنھوں نے غالب کو غالب بنایا۔انھیں وقت کے ساتھ ساتھ قبولیت عام ملنے کی چند وجوہات ہیں۔ایک تو یہ کہ ان کے مکتوبات نے شائع ہو کر اس عہد کے سیاسی اور سماجی ماحول کے اندرون میں چھپے رازوں کو منکشف کر دیا۔ناقدین نے عام طور پر غالب کی شاعری کی تفہیم ان کے خطوط میں موجود موضوعات کی روشنی میں کی۔انھیں ابتدا میں ہی مولانا حالی جیسا سوانح نویس اور عبدالرحمان بجنوری جیسا نقاد میسر آ گیا۔دربار شاہی سے وابستگی نے انھیں مغلیہ عہد کا آخری بڑا شاعر بنانے میں معاونت کی۔غالب کے نقاد ان کی شگفتہ مزاجی اور آزاد خیالی کی وجہ سے ان کے ساتھ جذباتی طور پر منسلک ہوئے۔ایسے ذہین معتقد کسی اور کو میسر نہیں آئے۔مجھ سے پوچھا جائے تو میں بہادر شاہ ظفر کو انیسویں صدی کا سب سے اہم شاعر قرار دوں گا۔اس کی بہت سی وجوہات ہیں، جن کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔اس کے باوجود اگر علمائے ادب غالب کو اہم ترین شاعر قرار دیتے ہیں تو میں ان کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔جہاں تک غالب کی شعری تقلید یا ان کے اسلوب کی پیروی کی بات ہے تو بعد کے کچھ شعرا میں کلی یا جزوی طور پر اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔موضوعات یا اسلوب کی پیروی اہم نہیں۔علامہ اقبال بیسویں صدی اور اس کے بعد کے اہم ترین شاعر ہیں۔ان کی وسیع پیمانے پر پیروی بھی ہوئی لیکن ان کے مقلدین میں ایک بھی بڑا شاعر نہیں۔اس کے برعکس میرا جی عوامی سطح پر کم مقبول ہیں لیکن جدید نظم کے شعرا نے سب سے زیادہ انھی کی تقلید کی۔گزشتہ صدی میں حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، اصغر گونڈوی اور احسان دانش جیسے اہم شاعروں کی موجودگی میں فراق گورکھ پوری اور ناصر کاظمی نئی غزل کے ترجمان بن گئے۔میرے خیال میں ہر دور کا بڑا شاعر اپنے ساتھ فکر اور فن کا ایک الگ جہان معنی لے کر آتا ہے۔اس کی اپنی ڈکشن ہوتی ہے۔ہمارے عہد میں شائع ہونے والے شعری مجموعوں کا مطالعہ کریں تو (عبدالعزیز خالد کے علاوہ) اپنے جواز کے ساتھ بہت کم الفاظ آپ کو میسر آئیں گے۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ نصف صدی میں اسلم انصاری، افتخار عارف، احمد مشتاق، احمد فراز، جون ایلیا، رضی اختر شوق ،عزیز حامد مدنی اور اس نوع کے دیگر اہم شاعروں کی موجودگی کے باوجود ظفر اقبال اور منیر نیازی دو ایسے شاعر ہیں جو اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔جن کو آنے والے دور میں ایک الگ زاویے سے دیکھا جائے گا۔یہ ایک اندازہ ہے ورنہ میں کوئی منجم ہوں نہ عالم۔

سوال: آج کل تنقید وتحقیق کا کیا معیار ہے؟

جواب: جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں زوال آیا ہے، تنقید وتحقیق کا شعبہ کیسے بچ سکتا تھا۔ مجھے کہنے کی اجازت دیں کہ ہماری جامعات میں گزشتہ چند سالوں میں سندی نوعیت کا تنقیدی وتحقیقی کام بہت ناقص ہے۔ انفرادی طور پر بہت سے لوگ اچھا کام بھی کررہے ہیں لیکن عام رویہ یہی ہے کہ گاڑی ایک جنکشن سے چلتی ہے اور دوسرے جنکشن پر آکر رک جاتی ہے۔

سوال: کیا مشرقی تنقید مغربی تنقید سے متاثر یا محض اس کا چربہ ہے؟

جواب۔ بہت اچھا سوال ہے۔ اس کے لیے ہمیں ماضی کی طرف ایک جست لگانی ہوگی۔ مشرق اور مغرب دو جڑواں بھائی ہیں لیکن ان کا باہمی تعلق ہابیل اور قابیل کا ہے۔ مشرق چونکہ طلوع آفتاب کی سرزمین ہے، اس لیے اس کے اجتماعی مزاج میں ایک خواب گوں قسم کی رومانویت اور جذباتیت ہے۔ اس کے برعکس مغرب نے زیادہ تر زندگی اور اس کے متعلقات کو شعور کی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں کے ادب میں شاعری نثر سے پہلے لکھی گئی اس لیے اس کا نثر کی طرف آنا دراصل دل سے دماغ کی طرف کا سفر تھا۔ مغرب (جس سے مراد عام طور پر یورپ اور امریکہ ہے) میں شعر اور شاعر پر ابتدا ہی سے ایک سوالیہ نشان لگا دیا گیا تھا۔ افلاطون کی شہرہ آفاق کتاب "دی ریپبلک" میں پیش کی گئی مثالی ریاست میں شاعروں کے لیے کوئی جگہ نہیں کیونکہ اس کے خیال میں شاعروں کے پاس ایک ایسا جذباتی نغمہ ہوتا ہے جو معاشرے کو بے عمل خیالی دنیا کی طرف لے جاتا ہے۔ افلاطون کے شاگرد ارسطو کی رائے اس کے برعکس تھی۔ اس کے بعد شاعری کی افادیت کے حوالے سے ملی جلی آرا سامنے آئیں جو بعد میں ایک شاندار تنقیدی روایت بن گئیں۔ اس کے برعکس مشرق میں شاعر اور شاعری کو ایک خاص قسم کی ماورائیت حاصل تھی۔ "الشعرا تلامیذ الرحمن" کے قول کے پیش نظر شاعری کو الہام کا درجہ حاصل تھا۔ مشرقی شعریات کی تاریخ پڑھیں تو عربوں کی شبینہ محفلوں میں شاعری ہی اظہار کا واحد ذریعہ تھی۔ ہر چوتھا آدمی شاعر تھا۔ فارسی ادب میں بھی شاعری کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اردو ادب کی ترتیب وتہذیب بھی انھی روایات کے زیر اثر ہوئی۔ اس لیے مشرقی ادب میں وہ تنقیدی رجحانات پیدا نہ ہوئے۔ اردو ادب میں میر کی ''نکات الشعرا'' سے آزاد کی ''آب حیات'' تک ایک خاص طرز فکر نے ضرور جنم لیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہماری توجہ باقاعدہ طور پر تنقید کی طرف ہوئی۔ ہمارے پاس مغرب کے تنقیدی شعور سے اخذ واستفادے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ جدید دور میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم مشرقی قدروں کی روشنی میں اپنا ایک الگ تنقیدی نظام وضع کرتے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ناقدین نے مغرب کے خوان نعمت سے ہی لقمے توڑے۔ یہ کہنا تو مناسب نہ ہوگا کہ ہماری تنقید مغربی تنقید کا چربہ ہے لیکن ابھی اس شعبے میں بہت سا کام ہونا باقی ہے۔ محمد حسن عسکری، سلیم احمد، ممتاز شیریں اور سراج منیر نے جس تنقیدی دبستان کی بنیاد رکھی تھی، اس کو حفیظ الرحمان خان، عبد العزیز ساحر، بصیرہ عنبرین، ارشد محمود ناشاد، محمد نبیق الاسلام اور عزیز ابن الحسن جیسے لوگوں نے جاری رکھا ہے۔ اس کے باوجود اس شعبے میں ابھی چند دیوانوں فرزانوں کی ضرورت ہے۔ تحقیق کے شعبے میں ہمارے ہاں بہت عمدہ کام ہوا ہے لیکن نقاد تو پھر بھی چند اچھے جملے لکھ کر اپنی تعریف وتوصیف سن لیتا ہے، محقق بے چارہ تو اس سے بھی محروم رہتا ہے۔

سوال: سوشل میڈیا نے ادب اور خصوصاً شاعری پر کیا اثرات مرتب کیے ہیں؟

جواب: ہم نے لکھنے کا آغاز کیا تو ہماری تربیت ایک باقاعدہ عمل کے تحت ہوئی۔ اپنی آواز دوسروں تک پہنچانا آسان نہ تھا۔ جدید ذرائع نے بہت سی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ آپ اپنی تخلیق کو آسانی سے دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بات خوش آئند ہے۔ اس کا ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ لکھنے والے محنت کرنے کے عادی نہیں رہے۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ نے فلاں مشاعرے میں جو غزل سنائی تھی، وہ بے وزن ہے، شاعری سنانے سے پہلے کسی کو دکھالیا کریں۔ بے چارے خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے، اسی شام میرے گھر آئے اور فیس بک پر وہی غزل دکھا کر کہنے لگے۔ ''آپ تو خواہ مخواہ الرجک ہوجاتے ہیں۔ دیکھیں، اس غزل پر کمنٹس اور لائکس کی تعداد تو دیکھیں۔'' اب سر کوٹنے کے علاوہ کون سا شغل رہ جاتا ہے۔

سوال: کیا ادیب اور شاعر منافق بھی ہوسکتے ہیں؟

جواب: اگر یہی سوال آپ سے کیا جائے تو آپ کا جواب کیا ہوگا۔ شاید آپ کو سماجی مقاطعے کی پروا نہ ہو لیکن میرے اندر کا خوف زدہ انسان شاید اس کا درست جواب نہ دے سکے۔ بہت سے واقعات ہیں، بیان کروں تو ہنگامہ ہوجائے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں ''پُرغیض خوئے سگاں'' سے زیادہ ''لطفِ کریمانہ خوش دلاں'' کا مشاہدہ ہوا۔ ایسے سایہ دار لوگ جنھیں دیکھ کر بادل بھی مینہ برسا دے۔ میری توجہ کا مرکز وہی محترم ہستیاں تھیں۔ ادبی دنیا میں اگر کسی نے میرے ساتھ ذرا سی نیکی بھی کی میں نے اسے اپنا محسن سمجھا۔ دوسری قسم کے لوگ جن کا آپ نے ذکر کیا، اگر ملے تو رستہ بدلنے میں عافیت سمجھی۔ پھر ان کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ البتہ عزت اور احترام کا رشتہ قائم رہا۔ عشق اور کار ہنر میں مصروف رہے۔ جسے ہم منافقت کا نام دیتے ہیں میں اسے معصومیت سمجھتا ہوں۔ مشاعروں میں جس طرح ایک شاعر دوسرے شاعر کی تحسین کرتا ہے۔ اکثر اس کی زبان اس کے دل کی ترجمان نہیں ہوتی۔ نفاق کے مختلف درجے ہیں۔ شاعر، ادیب منافق نہیں بلکہ معصوم لوگ ہوتے ہیں، سو ان کے اس عمل کو منافقت نہیں بلکہ مناقشت کہنا چاہیے، اور یہ رویہ کسی نہ کسی سطح پر ہر کسی کے ہاں موجود ہوتا ہے۔

سوال: ادبی گروہ بندیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میں ان کے حق میں نہیں، نہ ہی اس قسم کی کسی ادبی سیاست میں حصہ لے کر ولائتیں لوٹنے کی کوشش کی۔ خاموشی سے اپنا کام کرنے میں ہی عافیت جانی۔ ایک شاعر ادیب کے لیے ضروری ہے کہ اپنی شخصی تمکنت کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھے۔ میری شاعروں ادیبوں سے دوستی ہے، بہت سا پیار ملا، پذیرائی بھی ہوئی۔ مجھے میری توقع سے بڑھ کر سراہا گیا۔ میری کوشش بھی یہی رہی کہ کسی نہ کسی طرح ''پاس وضع'' کو قائم رکھا جائے۔ اگر دوستوں کا حلقہ بھی بنایا بھی تو وہ کسی خاص مقصد کے تحت نہ تھا۔ میرا تعلق مجید امجد کے شہر سے ہے، میرا ایمان ہے کہ اگر آپ کے لفظ میں طاقت اور کردار میں پختگی ہے تو آپ کو احترام ضرور ملے گا۔

سوال: میکسم گورکی کا سیاست سے بھی تعلق رہا، کیا ادیب کو سیاسی بھی ہونا چاہیے؟

جواب: روس کا چہرہ یورپ اور دھڑ ایشیا میں ہے، اس نے ایشیائی ہونے کے باوجود اپنے افکار ونظریات مغرب سے اخذ کیے۔ روسی ادیبوں کا سیاست سے گہرا تعلق رہا، دوستوفیسکی کا تو شاید فائرنگ سکواڈ سے سامنا بھی ہوا، پھر اچانک معافی اک اعلان ہوگیا۔ بڑا ادب خود مختار حیثیت رکھنے کے باوجود سیاست، مذہب، معاشیات وغیرہ سے استفادہ کرتا ہے۔ روسی ادیبوں نے اپنے

معاشرے میں انقلاب کا راستہ ہموار کیا۔ ہمارا ادب بھی عملی طور کم سہی لیکن سیاسی شعور سے بہرہ مند تھا۔ فکشن کی بجائے ہمارے ہاں شاعری کو عروج حاصل تھا، اس لیے ہمارے شعرا نے اس منصب کو سنبھالا۔ دوسری صورت میں آپ میر وسودا کی شاعری کو کہاں رکھیں گے۔ ترقی پسند تحریک کے وابستگان نے بھی عملی سیاست میں حصہ لیا۔ سجاد ظہیر تو باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن تھے، ادیب کے سیاسی ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کے قلم میں اتنی پاکیزگی ہو کہ لوگ اسے سچا انسان تسلیم کریں۔ کیفی اعظمی، علی سردار جعفری، جانثار اختر وغیرہ سیاسی کارکن بھی تھے لیکن ان کے مقابلے میں فیض احمد فیض کو پذیرائی ملی، اس کی وجہ فیض کے لب ولہجے کی رومانویت ہے۔ اچھا ادیب، ادب کو اولیت دیتا ہے، اس کے نظریات لامحسوس طریقے سے اس کی تخلیق کا حصہ بنیں تو قابل عمل ہیں دوسری صورت میں ان کی حیثیت جز وقتی ہے۔ شاعروں ادیبوں نے تو مذہبی افکار کو بھی شعر وسخن کا موضوع بنایا۔ ورجل، دانتے، رومی، سنائی اور اقبال کی آفاقی شاعری اسی کا حاصل ہیں۔ ادیب کے سیاسی یا مذہبی ہونے پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا، اس کی تخلیق میں اس کے عقائد ونظریات کسی نفاست سے پیش کیے گئے ہیں، یہ بات قابل غور ہے۔

سوال: پاکستان کے موجودہ ادبی ادارے ادب کی خدمت میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟

جواب: قیام پاکستان کے بعد ہمارے ہاں ادارہ ثقافت اسلامیہ، اردو سائنس بورڈ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، انجمن ترقی اردو پاکستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، مقتدرہ قومی زبان، بزم اقبال، اقبال اکادمی اور اکادمی ادبیات پاکستان جیسے اداروں نے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کسی نہ کسی حد تک ان ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے۔ لیکن ابھی بہت سی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ ان اداروں کی کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے انقلابی اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے۔ ان کی کارکردگی کا سالانہ جائزہ لیا جائے تاکہ یہ شخصیات کو نوازنے کی بجائے اصل معنوں میں ادب اور ادیب کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

سوال: مشاعروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ایک زمانہ تھا، شاعروں کی بادشاہانِ وقت کے دربار کے ساتھ وابستگی کو باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ ان کے متوسلین میں باقاعدہ طور پر ملک الشعرا کا ایک عہدہ موجود ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ وسائل میں کمی کے باوجود دہلی کے لال قلعے میں مقیم آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کے تخت سے بھی استاد ابراہیم ذوق جیسا شاعر وابستہ تھا اور باقاعدہ تنخواہ پاتا تھا۔ مرزا اسداللہ خاں غالب جیسا تخلیق کار دن رات ''غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا'' کی مالائیں جپتا تھا۔ مشاعرے میں ایک خاص قسم کا ماحول ترتیب پاتا تھا، جس کی موجودگی سامعین وحاضرین کو تخیل کے اڑن کھٹولے پر سوار کر دیتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو مشاعروں نے اردو زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ درباروں سے نکل کر بات جب میدانوں میں پہنچی تو علامہ محمد اقبال، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری اور جوش ملیح آبادی جیسے شاعروں کا چرچا ہوا، علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں اپنی مترنم آواز کے ساتھ نظمیں سناتے، مجالس اقبال کی راوی بیان کرتے ہیں کہ لوگ اقبال کی پُر تاثیر شاعری سن کر فرط جوش میں اپنی پگڑیاں اور ٹوپیاں ہواؤں میں اچھال دیتے اور ماہیِ بے آب اور مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے۔ بیسویں صدی کے پہلے نصف کے برصغیر میں شاعر، شعر اور سامع کی ایک ایسی تکون وجود میں آگئی تھی جس نے شعر وسخن کی دنیا کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ ہمارے قلب ونظر پر شاعری کی ایسی گہری چھاپ تھی کہ انگریزوں نے بھی اس ذوق کو ایک اور زاویے سے موضوعاتی نظموں کے مشاعروں میں تبدیل کیا۔ افسوس صد افسوس کہ حاکمانِ وقت نے شعر وسخن کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ ہمارے گورنر ہاؤس اور ایوان صدر میں مشاعرے تو ہوتے ہیں لیکن اس کے ثمرات مقتدر طبقے تک ہی پہنچ سکے ہیں۔ یہ تو خیر اونچی درگاہوں کا تذکرہ ہے۔ مشاعرہ گرد مافیا نے تو اپنے پاؤں چھوٹے چھوٹے ضلعی ہیڈ کوارٹرز میں بھی پھیلا لیے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ضلع کے حاکم اعلیٰ کی ایک خواہش ہم تک پہنچی۔ وہ لاہور میں اردو کی ترقی اور اس میں تحقیق وتدقیق کے مقصد کیلئے بنائی گئی ایک تاریخی انجمن کے سابق سربراہ کی خواہش پر مشاعرہ کروانا چاہتے تھے۔ ان کے پاس شاعرِ موصوف کی طرف سے فراہم کردہ شاعروں کی ایک فہرست بھی تھی۔ ان شعرا کو دیے جانے والے مجوزہ بھاری اعزازیے کی تفصیل بھی ساتھ اس پرچے کے منسلک تھی۔ اس طرح کے پروگرام مختلف ضلعوں میں منعقد ہونے تھے۔ افسوس کہ سرکاری سطح پر علم وادب کے فروغ کیلئے کی جانے والی یہ کوشش تکمیل نہ پا سکی۔ کسی زمانے میں مشاعرے کی صدارت اپنے عہد کے اہم ترین شاعر سے کروائی جاتی تھی۔ ایک ادھ مہمانِ خصوصی ہوتا تھا، لیکن آج کل صدر مشاعرہ کے ساتھ شاعروں کو مہمانان خصوصی، مہمانان اعزاز، خاص مہمان، خاص الخاص مہمان اور خصوصی آمد کے عہدے تفویض کر کے ہال بھرا جاتا ہے۔ عوام کو شاعری سے غرض ہے نہ مشاعروں سے کوئی سروکار۔ اکثر شعرا حضرات اس عالم خاک وباد میں اپنے جیب خرچ سے مشاعرہ گاہوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ مشاعرہ گردی ایک باقاعدہ اصطلاح ہے۔ اس کے باوجود میں ایک وجہ سے مشاعروں کو پسند کرتا ہوں کہ ان میں مبتدیوں کے لیے دلچسپی کا مواد ہوتا ہے۔ ان دنوں پاکستان اور انڈیا میں جس طرح کے مشاعرے ہو رہے ہیں، ان پر تبصرہ کرنا مناسب نہیں۔ بس یہ عرض کروں گا کہ سٹیج ڈرامے کی کوئی نیم ادبی سی صورت ہے۔ کسی شاعر نے کہا تھا:

شاعر کو مست رکھتی ہے تعریف شعر کی
سو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ واہ میں

سو واہ واہ کا حصول ہی اہل شعر کا مقصود نظر ہے۔ ضرورت ہے کہ مختلف ادبی موضوعات پر مذاکرے، سیمنار اور مشاعرے ایک ساتھ منعقد ہوں تاکہ شاعری سنانے کا مقصد داد حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سامعین کے فلسفۂ محبت کی تہذیب کرنا بھی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ عام سامع کے فکر ونظر میں بلندی لانے کی سعی بھی کی جائے تاکہ وہ شوق سے مشاعرہ گاہ کا رخ کرے۔

سوال: نوجوان لکھنے والوں کے لیے کوئی پیغام دیں؟

جواب: ایک نوجوان نے مجھے فون کر کے کہا کہ ''سر! میں نے ایک ناول لکھا ہے، آپ کو دکھانا چاہتا ہوں''۔ کچھ دنوں بعد وہ ایک رجسٹر لے کر میرے پاس آیا۔ ناول تو کیا تھا، رجسٹر کے اوراق کو مختلف اشعار اور اقوال زریں سے سیاہ کر رکھا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھا۔ مجبوراً سکوت اختیار کرنا پڑا۔ کہنے لگا، ''سر! کیا یہ چھپ جائے گا؟'' میں نے جواب دیا، کیوں نہیں؟ اس نے پھر سوال کیا، ''رائلٹی ملے گی؟''۔ ہاں۔ مجھے شرارت سوجھی۔ اس کے بعد کے سوال نے تو مجھے حیرت زدہ کر دیا، کہنے لگا، ''سر! یہ ادب کا نوبل انعام کیسے ملتا ہے؟''۔ میرا مشورہ ہے کہ ان کی خواہشات اس نوجوان جیسی ہونی چاہیں لیکن اس کے لیے دن رات محنت کریں تاکہ ان کی تخلیق فن کی بلندیوں کو چھو لے۔

ادبی خبریں

✦ بزمِ کیفِ سخن کے زیرِ اہتمام مشاعرہ 24 فروری کو بروز ہفتہ شام 4 بجے رہائش گاہ جسٹس (ر) میاں نذیر اختر جوہر ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت اُردو اور پنجابی کے نامور شاعر پروفیسر عباس مرزا نے کی۔ مہمانِ خصوصی قاری صادق جمیل جبکہ مہمانِ اعزاز عبدالرزاق ایزد تھے۔ نظامت کے فرائض حسن عباسی نے ادا کیے۔ تقریب مشاعرہ دو ادوار پر مشتمل تھی۔ پہلے دور میں شعرائے کرام نے نعتیہ کلام پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ دوسرا دور نظم و غزل پر مشتمل تھا۔ تلاوت اور نعت شریف پڑھنے کی سعادت جاوید منظور نے حاصل کی۔ اُس کے بعد میزبان اور ''بزمِ کیفِ سخن'' کے سرپرست جسٹس (ر) میاں نذیر اختر نے تمام مہمان شعراء و سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب میں جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا اُن میں جسٹس (ر) میاں نذیر اختر، حسن عباسی، پروفیسر عباس مرزا، قاری صادق جمیل، عبدالرزاق ایزد، احمد سبحانی آکاش، ہمایوں پرویز شاہد، زاہد قاسمی، ناصر آغا، خواجہ عازم اور عقیل شافی شامل ہیں۔ تقریب کے بعد Hi-Tea کا انتظام تھا۔

✦ ادارہ ''کتاب قبیلہ'' کے زیرِ اہتمام نامور دانشور، صحافی، مدیر ادبِ لطیف، مدیر بک ڈائجسٹ اور چیف ایگزیکٹو، ''کتاب ورثہ'' جناب مظہر سلیم مجوکہ کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت بختیار علی سیال ایڈووکیٹ، جج (ر) عدالت انسداد دہشت گردی نے کی۔ مہمان خاص مظہر سلیم مجوکہ تھے۔ جبکہ مہمانِ اعزاز نامور شاعر تاثیر نقوی تھے۔ تقریب کے آغاز میں صاحبِ شام نے اپنی زندگی، تعلیمی کیریئر، پیدائش، بچپن سے متعلق گفتگو کی۔ اُس کے بعد مختلف شخصیات نے ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے اعتراف میں اظہارِ خیال کیا۔

✦ ادبی و ثقافتی تنظیم ''زاویہ'' کے زیرِ اہتمام اُردو نظم اور غزل کی نہایت عمدہ شاعرہ ڈاکٹر ثروت زہرا کے تازہ شعری مجموعے ''کتنے یگ بیت گئے'' کی تقریب رونمائی اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر احسان اکبر نے کی۔ جناب محمد حمید شاہد، محترمہ پروین طاہر، جناب اختر عثمان، ڈاکٹر رضوان علی اور ڈاکٹر صلاح الدین درویش نے کتاب کے حوالے سے اظہارِ خیال کیا۔ تنظیم کی نظامت کے فرائض زاویہ کے روحِ رواں محبوب ظفر نے ادا کیے۔

✦ عالمی ادبی تنظیم ادارہ خیال وفن لاہور کے زیرِ اہتمام معروف شاعر شکیل احمد زیب کے پہلے شعری مجموعہ ''کلامِ شکیل'' کی تقریب رونمائی اور محفل مشاعرہ 19 فروری 2024ء کو اکادمی ادبیات لاہور میں منعقد ہوئی۔ نظامت کے فرائض تنظیم کے صدر ممتاز راشد لاہوری نے ادا کیے۔ اس میں معروف شعراء کے علاوہ سامعین نے بھی بھرپور شرکت کی۔

✦ ادارہ ادب افروز جہلم کے زیرِ اہتمام رفاء انٹرنیشنل کالج کے لائبریری آڈیٹوریم میں ایک نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت اقبال ناظر نے کی۔ مہمانانِ خاص سعید میر اور رحمت اللہ جاوید تھے۔ نظامت کے فرائض شکیل کاسی نے نبھائے۔ اجلاس کے پہلے دور میں غزل کے ارتقاء کے موضوع پر مباحثہ ہوا۔ دوسرے دور میں شعراء کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔

✦ ''بزمِ علم وفن'' ہزارہ شاخ کے زیرِ اہتمام ایک شامِ افسانہ کا انعقاد کیا گیا۔ صاحبِ شام محمد حمید شاہد تھے۔ اس تقریب کی صدارت احمد حسین مجاہد نے کی۔ مہمانِ اعزاز الحمد اسلامک یونیورسٹی کے صدر شعبہ اور ڈین ڈاکٹر شیر علی تھے۔ جنہوں نے اپنی گفتگو بعنوان افسانہ اور عہد حاضر کی۔ نظامت کے فرائض عادل سعید قریشی نے ادا کیے۔

✦ 2 فروری 2024ء فاران کلب کراچی، بزم نگار ادب پاکستان نے بہ اعزاز ممتاز سینئر شاعر و صحافی راشد نور کی طویل شعری، ادبی و صحافتی خدمات کے اعتراف میں فاران کلب کراچی میں ایک تقریب و مشاعرہ کا انعقاد کیا۔ جس کی صدارت خواجہ رضی حیدر نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر شاداب احسانی اور رفیع الدین راز تھے۔

✦ ایف جے رائٹرز فورم کے زیرِ اہتمام پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج آرٹ اینڈ کلچر (PILAC) لاہور میں ایوارڈ کی تقریب منعقد ہوئی جس میں اصنافِ ادب میں نمایاں کتب کو جیوری کے فیصلے کے مطابق ایوارڈز سے نوازا گیا۔

✦ بزمِ احبابِ قلم پاکستان کے زیرِ اہتمام راولپنڈی آرٹس کونسل کے تعاون سے معروف شاعر حسن عباس رضا کے اعزاز میں خصوصی تقریب 29 فروری 2024ء کو راولپنڈی آرٹس کونسل اسٹیڈیم روڈ راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔ صدارت جناب افتخار عارف نے کی۔ اظہارِ خیال محترم احمد فرہاد، محترمہ حمیرا اشفاق، محترمہ امینہ بی بی اور نظامت ڈاکٹر فاخرہ نورین نے کی۔

تقریب کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں حاضر شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔

❀❀❀

اگر آپ کے لفظ میں طاقت اور کردار میں پختگی ہے تو آپ کو احترام ضرور ملے گا

ادب جدید یا قدیم نہیں بلکہ زمانے کی ایک رو کے تابع ہے

معروف شاعر، نقاد، مترجم اور صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ساہیوال

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

سے معروف شاعرہ، کالم نویس اور

مدیرہ ارژنگ **لبنیٰ صفدر** کا مکالمہ

ادیب کے سیاسی ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس کے قلم میں اتنی پاکیزگی ہو کہ لوگ اسے سچا انسان تسلیم کریں

سوال: اپنی ذاتی زندگی، پیدائش، تعلیم اور پیشہ وغیرہ سے متعلق بتائیں۔ مطبوعات کی تفصیل بھی بیان کریں؟

جواب: میرے اجداد کا تعلق دریائے راوی کے کنارے پر موجودہ قدیم رجواڑوں سے ہے۔ یہاں آباد قبائل نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں رائے احمد خان کی قیادت میں برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کے خلاف آواز اٹھائی، ان کی عسکری لحاظ سے کی گئی بھرپور مزاحمت کو تاریخ اہم مقام حاصل ہے۔ اس علاقے کے باشندوں میں سے

بہت سے لوگوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ کچھ کو سزا کے طور پر کالے پانی (جزائر انڈیمان) بھیج دیا گیا۔ ان سورماؤں کی بہادری کی داستانیں آج بھی مقامی پنجابی صنف ڈھولے میں موجود ہیں۔ میرے آبائی علاقے کی تہذیب کو سمجھنے کے لیے ان قدیم شعری نمونوں کو پڑھنا ضروری ہے۔ اس علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد اسے شعوری طور پر علم ودانش کی دولت سے محروم رکھا گیا۔ چند دہائیوں میں اس کی تہذیب اور زبان کو غیر مہذب قرار دے کر یہاں کے باشندوں کو ''ریڈ انڈین'' بنا دیا گیا۔

میرے آبائی قصبے نور شاہ میں کوئی مناسب سکول نہ تھا۔ مالی وسائل کم ہونے کے باوجود میری والدہ نے مجھے ملتان میں مقیم خالہ کے ہاں ایک غیر ملکی مشنری سکول میں داخل کروایا۔ کچھ عرصہ ساہیوال کے سینٹ پال ہائی سکول میں بھی زیر تعلیم رہا۔ ابھی میں پانچ سال کا تھا کہ کچھ گھریلو مسائل کی وجہ سے مجھے گاؤں کے سرکاری پرائمری سکول میں داخلہ لینا پڑا۔ اس کے بعد مقامی گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1994ء میں گورنمنٹ کالج ساہیوال سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ میں کالج کے دنوں میں بزم اردو کا صدر اور کالج میگزین کا طالب علم مدیر بنا۔ قومی روزناموں کے ادبی صفحات پر میری شاعری کو جگہ ملی۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

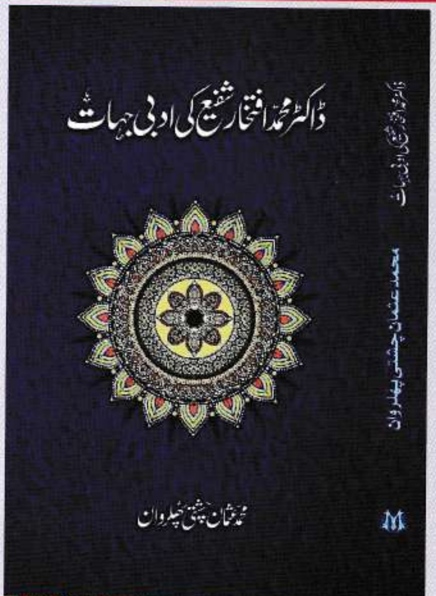

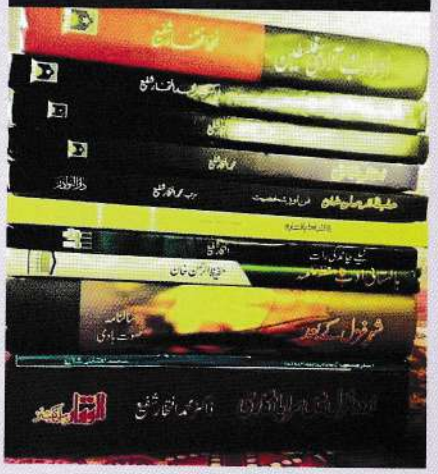

معروف ادیب، شاعر، کالم نگار، مدیر اور مترجم **عامر بن علی** کا تاریخی ادبی کارنامہ

لاطینی امریکہ کے نوبل انعام یافتہ شعراء کے کلام کا
ہسپانوی سے براہِ راست اردو زبان میں ترجمہ

دوسرا ایڈیشن
شائع ہو گیا ہے

Price
700
Rupees

محبت کے ۲ رنگ

گبریلا مسترال اور پابلو نرودا

پاکستان کے اہم کتب خانوں کے علاوہ ای۔ کامرس کی تمام اہم عالمی ویب سائٹس پر دستیاب ہے۔

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com